جون 2021ء
شمارہ نمبر 2
اردو ادبیات کا نقیب اور تحقیق و تنقید کا اشاریہ
ماہنامہ
سخن دان
اسلام آباد، پاکستان

شمارہ نمبر 02	اردو ادبیات کا نقیب اور تحقیق و تنقید کا اشاریہ	جون 2021ء

ماہنامہ

ضروری ہدایات

☆...... تمام مشمولات مجلسِ ادارت کے باہمی مشورے کے بعد ہی قبول یا رد کیے جاتے ہیں۔

☆...... انتظامیہ کا مندرجات سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

☆...... غیر مطبوعہ مضامین و منظومات ہی قبول کیے جاسکتے ہیں۔

☆...... اپنی تخلیقات شامل کروانے کے لیے ہر ماہ کی 05 تاریخ سے قبل ہی مجلسِ ادارت کے کسی رکن سے مشورہ کر سکتے ہیں۔

☆...... انتظامیہ کے موبائل نمبرز اور ای میل ایڈریس نیچے ملاحظہ فرمائیں۔

تحقیقی و تجزیاتی مضامین، افسانے، غزلیات، خاکے اور کلام برائے تنقید پیش کرنے کے لیے ان نمبرز پر وٹس ایپ یونیکوڈ/ڈوکس/ورڈ فائل میں مواد پیش کریں۔ +923115929589 / +923035054101

یا اس ای میل ایڈریس پر ارسال فرمائیں : gmdaaim133@gmail.com

مشمولات

توصیف وثنا

مضامین

افسانے

سلسلۂ شرحِ کلامِ غالب

منظومات

تراجم

رحمان حفیظ

حمد باری تعالیٰ

یہ مناجات مرے واسطے آساں کر دے
جو تری شان ہے اس شان کے شایاں کر دے

کسی خورشید کا، مہتاب کا محتاج نہ رکھ
خود مرا حجرۂ افکار فروزاں کر دے

فرش پر بیٹھے ہوئے پر وہ نوازش فرما
عرش والوں کو جو انگشت بدنداں کر دے

میں تو بوسیدہ چٹائی پہ بھی خوش ہُوں لیکن
کیا عجب تو جو اسے تختِ سلیماں کر دے

یا الہیٰ! مجھے شاہی کی تمنّا ہی نہیں
بس غلامانِ محمد ﷺ میں نمایاں کر دے

مہلتِ بارِ دگر کس کو ملی ہے لیکن
تو جو چاہے تو مکرر بھی یہ احساں کر دے

ڈاکٹر کاشف عرفان

نعتیہ نظم

(ایک پیغام ؛ چارلی ایبڈو کے نام☆)

چلو آؤ! !
یہاں ہم بیٹھ کر یہ فیصلہ کر لیں
ہمارے درمیاں
یہ جنگ اب
تہذیب کے اس آخری منظر تلک جاری رہے گی
یا
محبت، امنِ دنیا کی نئی تاریخ کا حصہ بنیں گے
ابھی میدان لگنا ہے
تمھیں پرخاش ہے ان رحمت اللعالمیں سے جو
کھلے دشمن، منافق اور شر انگیز لوگوں پر
ردائے عفو و رحمت تان لیتے تھے
مگر وہ زہر جو دل کی رگوں میں ہو
اسے پہچان لیتے تھے
محبت بانٹنا دنیا کو آقا نے سکھایا تھا
علوم و آگہی کے
سارے سوتے بھی اسی تہذیب سے پھوٹے
مگر افسوس تم نے علم کا چہرہ نہیں دیکھا
سنو! دیکھو!
تمہارا بھائی، بیٹا
علم و دانش کے سمندر کا شناور
مائیکل ہارٹ☆☆ لکھتا ہے:

☆......ڈنمارک کے اس نام نہاد میگزین / جریدے کا نام جس نے آقا کریم صل اللہ علیہ و سلم کی شان میں گستاخی کی جرأت کی۔

☆☆......عیسائی فلسفی اور دانشور جس نے ''سو عظیم ترین لوگ'' نامی کتاب لکھی اور ترتیب میں حضرت محمد صل اللہ علیہ و سلم کو ترتیب کے لحاظ سے سر فہرست رکھا۔ کتاب کے دیباچے میں اس نے لکھا کہ محمد صل اللہ علیہ و سلم وہ پہلے مذہبی پیشوا تھے جنہوں نے مادیت کو روحانیت سے ملایا۔ دین و دنیا کو یکجا کیا۔

محمد (ﷺ) وہ نبی تھے
جن کی حکمت نے
زمانے کو کوئی تہذیب کا خوگر بنایا تھا
ملایا تھا مرے سرکار نے
دنیا کو دینِ حق کی رحمت سے
تمہیں معلوم ہے
مورس بکائے ☆☆☆ کون تھا؟
کس بات کا پرچار کرتا تھا؟
تمہارا ہم وطن تھا
ہم زبان و ہم قبیلہ تھا
وہ کہتا تھا:
یہی اسلام ہے جس نے
غلاموں، عورتوں، بچوں، بزرگوں میں
حقوقِ زندگی بانٹے
پرندوں، جانور اور رینگتے کیڑوں، درختوں کو
زمیں پر زندگی دی ہے
محبت، علم، حکمت، آگہی کی روشنی دی ہے
چلو آؤ!
یہاں ہم بیٹھ کر
ساری ہی الہامی کتابوں کو
ذرا پھر کھولتے ہیں
دیکھتے ہیں...... مسئلہ کیا ہے؟

چلو! تورات سے پوچھیں
ذرا انجیل سے معلوم کرتے ہیں
تمھیں کیونکر عداوت ہے محمد (ﷺ) سے
کہ جن کی رحمتوں نے ہر زماں کو اپنا گرویدہ بنایا تھا
مگر تم بے خبر نکلے
مرے آقا محمد (ﷺ) تھے
صدائے آدمؑ و موسیٰؑ
خلیل اللہؑ نے سرکار کے مبعوث ہونے کی بشارت دی
مرے سرور تھے وہ
جن پر
مسیحا رشک کرتے تھے
جسے تم آج منطق مانتے ہو
روشنی ہے میرے آقا کی
کتابیں، پھول، خوشبو اور ستارے
کھیلتے بچے
مرے مذہب کے جیتے جاگتے چہرے
تعصب نے تمہاری آنکھ سے پہچان چھینی ہے
چلو آؤ!
یہاں ہم بیٹھ کر یہ فیصلہ کر لیں
مرے رہبر سے کیوں اتنی عداوت؟
مسئلہ کیا ہے؟

☆☆☆......مورس بکائے پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر اور تقابل ادیان کا ماہر تھا۔ عیسائی تھا۔ قرآن کے مطالعے نے دل کی دنیا بدلی اور مسلمان ہو گیا۔ بعد میں اپنی مشہور زمانہ کتاب ''قرآن، بائیبل اور سائنس'' لکھی۔

اداریہ

ناقوس

شائقینِ ارتقائے زبان وادب! اللہ کے فضل وکرم سے برقیاتی ادبی مجلے ''سخن دان'' کا دوسرا شمارہ مجلسِ ادارت کی ریاضت کا ثمر بن کے شجرِ اردو پر اپنا رنگ دکھا رہا ہے۔

سیلِ کرونا اپنے طوفانی بہاؤ میں جانے کیا کچھ اور کس کس کو نگلتا چلا گیا مگر ان اہلِ قلم کیلیے داد تو بنتی ہے جنھوں نے اس سمندر میں قلم کا زور لگا کر قرطاسی جزیرے نمودار کیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سیاسی، سماجی اور ادبی تاریخ بہت جلد قبلِ کرونا اور مابعدِ کرونا کی تقسیم سے دوچار ہونے والی ہے۔

اس میں بھی دو آرا نہیں کہ اس عالمی وبا نے ادب کی ہر صنف پر مثبت / منفی اثر ضرور مرتب کیا اور کچھ بعید نہیں کہ مابعدِ کرونا میں کئی نثری اور شعری شاہکار ادبی افق پر جلوہ گری کریں۔

خیر! جیسا کہ اولین شمارے میں عرض کیا تھا کہ قصداً و عمداً کوشش ہو گی کہ اردو ادب کے نثری رنگ کو زیادہ اجاگر کیا جائے تو موجودہ شمارے میں اسی ارادے کی واضح جھلکیاں آپ دیکھ پائیں گے۔ اردو اصنافِ ادب کی تفہیم، توضیح و تجزیاتی مطالعے کے قدرے ویران علاقوں کی آبیاری کر کے اسے سرسبز کرنے کی مہم جوئی بھی مجلسِ ادارت کے عزائم میں شامل ہے۔ کلاسیکی شعرا و ادبا کے فن پاروں کا انتقادی عدسے سے جائزہ لیتے ہوئے دورِ جدید کے قد آور اہلِ نظم و نثر کی تحریروں کا معروضی خوردبین سے مشاہدہ اس لحاظ سے ایک رجحان ساز سلسلہ کہلانے کے لائق ہے کہ اس کو منظم انداز میں چلانے کی روایت ماضی قریب و بعید کے بیشتر جریدوں میں کم کم ہی دکھائی دیتی ہے۔ بہر حال جب جب اس پر کام ہوا وہ ستائش کا مستحق تو ہے۔

اصحابِ حرف و لفظ! اوپر بیان کردہ تعارف کا ایک مقصد یہ ہے کہ جن قارئین اور لکھاریوں کو واقعتاً نقد و نظر کا چسکا ہے تو انھیں مبارک ہو کہ تنقید باقاعدہ تخلیق کی مسند پر فائز ہو چکی ہے اور اتنا بڑا دعویٰ کرنے کے لیے ''الدعویٰ مع الدلیل'' کے مصداق مدّعی کے پاس دلائل کا اسلحہ خانہ ہونا ناگزیر ہے۔

تخلیق کا مخرج و منبع کیا ہے؟ کونسے عوامل تخلیق کے پیچیدہ عمل پر اثر انداز ہوتے ہیں؟ وہ جو آمد و آورد والا معاملہ ہے کیا اس کی آج تک کوئی سائنسی تشریح مفصل انداز میں کی گئی ہے؟

ان کے جوابات کے لیے تصور کیجیے کہ ایک انسان کی پیدائش سے لے کر سنِ بلوغت تک اسے خلا میں رکھا جاتا ہے اور کچھ ذخیرۂ الفاظ سے اس کی اخلاقی تربیت کا اہتمام بالاقساط کیا جاتا ہے۔ کیا ایسا شخص پچیس تیس سال کی عمر میں کوئی ادب پارہ تخلیق کر پائے گا؟ ظاہر ہے جواب ایک وزنی ''نہیں'' میں ہو گا۔ اس کی کئی منطقی و سائنسی وجوہ ہیں: اول یہ کہ انسان ''علمہ البیان'' کے طفیل حیوانِ ناطق ہے۔ دوم یہ کہ ''علم بالقلم'' کی نعمت کے وسیلے سے انسان جبلی طور پر اپنے ماحول سے شعوری و لاشعوری تعامل کرتے ہوئے قلم اٹھاتا ہے۔ تیسری وجہ یہ کہ ''وعلم آدم الاسماء'' کے صدقے اسے اشیا و مظاہر نظر آتے ہیں۔ تخلیقی میکانکی عمل سے وہ نئی اشیا دریافت کر کے انکے نام رکھتا ہے۔ چوتھی وجہ انیسویں صدی میں غالب نے

حضرتِ انسان کو ''حیوانِ ناطق'' کہہ کر حسِ لطافت و ظرافت کو اس کے لیے لازم و ملزوم گردانا بھی اور اپنی زندگی میں ثابت بھی کیا۔ اب پانچویں دلیل کے چوکور خانے کے مرکز میں خود ابھرتی دکھائی دے گی: انسان سماجی جانور ہے۔ انسان خلا میں کن مظاہر سے تعامل کرے گا۔ اقبال نے اپنی شہکار نظم ''روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے'' میں اسی تناظر میں یہ معنیٰ خیز شعر کہا تھا:

کھول آنکھ زمیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ　　مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

اس نظم کے عنوان میں ''روحِ ارضی'' اپنی جگہ بہت گہرے معانی سے لبریز ہے۔ زمین کا قالب انسانی آبادی ہے ورنہ قبلِ ہبوطِ آدم تو یہ بے قالب روح تھی۔

اب اس پورے بیانیے کو سامنے رکھ کر سوچیے تو منطقِ استخراجیہ سے کچھ یہ صورت برآمد ہوتی ہے:

ادیب اور شاعر + ماحول + مشاہدہ = تخلیق (شعری/نثری)

نقاد/تجزیہ نگار + پیش کردہ تخلیق + مشاہدہ و تجزیہ = تنقیدی فن پارہ

گویا ایک طرف نثر نگار یا شاعر کی تخلیق کا کل دار و مدار مظاہرِ فطرت کے مشاہدے پر منحصر ہوتا ہے تو دوسری طرف ناقد و مبصّر کے لیے مظاہرِ فطرت کا اہم ترین جُزو انسان، پہلے سے ایک تخلیق کو بطورِ مظاہر و مناظرِ فطرت پیش کرتا ہے، جس کے ساتھ ناقد کا وہی تعامل ہوتا ہے جو شاعر یا ادیب کا اپنے ماحول سے ہوتا ہے۔

احباب! یاد رہے کہ بات ایک قولِ عظیم ''الدعویٰ مع الدلیل'' کی مضبوط بنیاد پر شروع ہوئی تھی، سو راقم الحروف نے کوشش کی کہ کسی مجذوب کی بڑ یا جذباتی نعرے کی بجائے مدلل طریق سے اپنی بات کی ترسیل و ابلاغ کا احسن عمل کیا جائے۔ مجھے ان دلائل کی تائید یا تردید کا کسی مراسلے یا باقاعدہ مضمون کی صورت شدت سے انتظار رہے گا کہ بدقسمتی سے صحت مند مکالمے کی فضا اور روایت جو عدمِ برداشت کے لیے تریاق کا درجہ رکھتی ہے، ہم جیسے تیسری دنیا کے سیاسی و سماجی شعور کی منازل سست روی سے طے کرتے معاشروں میں بہت کم پنپ سکی ہے۔

سو ''سخن دان'' کے منشور کے بنیادی نکات میں ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے کہ اس مثبت روایت کو کالعدم ہونے سے بچایا جائے۔ اسی لیے آپ کو اس مجلے کے صفحات پر متن و ورائے متن یہی پیغام ملے گا۔ امید ہے پیش کردہ بیانیہ بہت سے قارئین اور لکھاریوں کے لیے ایک قوی تحریک کا سامان کرے گا جو بلاشبہ ایک مبارک عمل ثابت ہوگا۔

زیرِ نظر شمارے میں ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر لکھی جانے والی ایک کتاب ''انگارے'' کا فنی جائزہ، ایک ایسا نثر پارہ ہے جو قاری کے ذہن پر دیرپا اثرات چھوڑنے کی صلاحیت سے مالا مال ہے۔ اس کے علاوہ شرحِ کلامِ غالب بقلم دائم کا سلسلہ بھی دل چسپی سے بھرپور ہے۔ کچھ طبع زاد اور کچھ زبانِ غیر سے اردو کو اپنائی افسانوں اور نظموں کی ایک چمک دمک رکھتی کہکشاں بھی اسی شمارے میں جلوہ افروز ہوگی۔ باقی کچھ مقالہ/مقالچہ نما تحقیقی و تجزیاتی مضامین بھی اشتہائے فکر بجھانے کیلیے زینتِ اوراق بنے ملیں گے۔

محمد شاہد حفیظ میلسی

اردو افسانے میں ''انگارے'' کی روایت

افسانہ کیا ہے؟

افسانہ کے لغوی معنٰی ''جھوٹی بات، قصہ، کہانی'' کے ہیں۔ یہ صنف انگریزی ادب کے وسیلے سے اردو میں آئی۔ انگریزی میں افسانہ کا کوئی مستقل لفظ موجود نہیں ہے اس لیے انگریزی لفظ Short-Story کے اردو ترجمے ''مختصر افسانہ'' کو اس صنف کے لیے اختیار کیا گیا اور فکری و فنی لوازم بھی انگریزی صنف Short-Story سے ہی مستعار لیے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ناقدین کے ہاں یہ جملہ عام ملتا ہے کہ اردو مختصر افسانہ، انگریزی شارٹ سٹوری کی ہی دین ہے۔ افسانہ کا لفظ بھی بالعموم مختصر افسانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ افسانہ اپنے اصطلاحی اور تکنیکی مفہوم میں غزل کے بعد اردو کی سب سے مقبول صنف ہے اور غزل ہی کی طرح افسانہ لکھنا بظاہر جس قدر آسان ہے اچھا افسانہ لکھنا اتنا ہی مشکل ہے۔

مختصر افسانے کی کوئی جامع و مانع تعریف ممکن نہیں۔ سادہ الفاظ میں مختصر کہانی کو افسانہ کہتے ہیں۔ یعنی ایسی مختصر کہانی جس میں زندگی کے کسی ایک پہلو کی کہانی بیان کی گئی ہو، جسے ایک نشست میں پڑھا جا سکے اور جس میں مختصر وقت میں ایک جگہ کے واقعات موجود ہوں۔

ڈاکٹر انور جمال نے ''ادبی اصطلاحات'' میں افسانہ کی تعریف لکھی ہے کہ:

> ''افسانہ اصطلاحاً اردو ادب کی نثری صنف ہے جس میں قصہ، واقعہ، کہانی، حقیقت کی نقیض جھوٹ، جھوٹی کہانی یا بات کو زیبِ داستاں کے لیے بڑھانا مقصود ہوتا ہے۔ افسانہ داستان کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ داستان جو مافوق الفطرت اور غیر عقلی واقعات کا پلندہ تھی، نسبتاً حقیقی شکل میں ناول بنی اور پھر بیسویں صدی کے مشینی دور نے اسے مزید نکھار کر ''افسانہ'' بنا دیا''۔(01)

پروفیسر وقار عظیم لکھتے ہیں:

> ''کسی ایک واقعے، ایک جذبے، ایک احساس، ایک تاثر، ایک اصلاحی مقصد، ایک رومانی کیفیت کو اس طرح کہانی میں بیان کرنا کہ وہ دوسری چیزوں سے الگ اور نمایاں ہو کر پڑھنے والے کے جذبات و احساسات پر اثر انداز ہو۔ یہ افسانے کی وہ امتیازی خصوصیت ہے جس نے اسے داستان اور ناول سے الگ کیا''۔ (02)

مغرب میں ایڈ گر ایلن پو (EdgarAllenPoe) کو مختصر افسانے کا بانی سمجھا جاتا ہے جس نے افسانے کو الگ صنفِ نثر کی حیثیت دی۔ بعد میں یورپین ادیبوں موپساں، ٹالسٹائی، میکسم گورکی اور لارنس نے اس صنف کو عظمت عطا کی۔ افسانہ کی تعریف ایڈ گر ایلن پو نے یوں کی ہے کہ:

> ''یہ ایک نثری داستان ہے جس کے پڑھنے میں ہمیں آدھ گھنٹہ سے دو گھنٹہ تک کا وقت لگے''۔(03)

ناول اور افسانے میں فرق:

افسانہ ناول کے بعد کی چیز ہے۔ ناول کی طرح یہ بھی انگریزی ادب کے توسط سے آیا۔ انگریزی کے علاوہ دیگر زبانوں بالخصوص روسی اور فرانسیسی افسانوں نے بھی اردو کے افسانہ نگاروں کو متاثر کیا لیکن یہ افسانے بھی انگریزی ترجمے کے وسیلے سے ہی اردو میں آئے۔ ناول کے ساتھ ساتھ اردو افسانے کا ارتقا ہوتا رہا اور آج اردو کی یہ سب سے مقبول صنف نظر آتی ہے۔ اس میں مختصر طور پر داستان اور ناول کے وہ تمام عناصر موجود ہیں جنھیں صدیوں سے تفریحی، اخلاقی اور تنقیدی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ مثلاً کہانی، کردار، خاکہ، رومان، منظر نگاری، پلاٹ اور جذبات نگاری وغیرہ۔

افسانے اور ناول کا بنیادی فرق یہ ہے کہ ناول طویل اور افسانہ مختصر ہوتا ہے۔ لیکن ناول اور افسانے میں فرق صرف طول اور اختصار کا نہیں، دونوں کے فن اور تکنیک میں بھی فرق ہے۔ ناول میں زندگی کا کینوس مکمل یا پھیلا ہوا ہوتا ہے اور اس کے مختلف گوشوں کو سامنے رکھ کر زندگی کا ایک مکمل اور مربوط نقشہ ابھرتا ہے۔ افسانہ نگار زندگی کی اس بوقلمونی میں سے کسی ایک پہلو پر توجہ مرکوز کرتا ہے۔ وہ ایک زاویہ سے اس پہلو کا بھرپور اور مکمل تجزیہ کرتا ہے۔ طویل مناظر، پس منظر اور طویل مکالمے افسانے کی تکنیک سے خارج ہیں۔ ناول میں بہت سے کردار ہوتے ہیں اور افسانے میں چند ایک ضروری کرداروں کا ذکر ہوتا ہے اور ناول میں کرداروں کی زندگی پر روشنی ڈالی جاتی ہے جب کہ افسانے میں زندگی کا صرف ایک رخ اور مزاج کا ایک پہلو اجاگر کیا جاتا ہے۔

سید وقار عظیم لکھتے ہیں کہ:

> ''ناول وافسانہ میں نمایاں فرق ان دونوں کا طول اور اختصار ہے اور صرف اس فرق کی وجہ سے دونوں میں بہت فنی اور لطیف فرق پیدا ہو گئے ہیں''۔ (04)

افسانے کی اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں ناول، ڈرامہ، شاعری اور فنونِ لطیفہ کی خصوصیات ایک جگہ موجود ہیں۔ اسے پڑھنے میں اتنا کم وقت صرف ہوتا ہے کہ ہر شخص اسے اپنے تھکے ہوئے دماغ کے لیے بہترین دلچسپی سمجھتا ہے۔ افسانے کی ضرورت اس وقت محسوس ہوئی جب انسانی زندگی مصروف ہو گئی اور انسان کے پاس ناول پڑھنے کے لیے وقت نہ رہا۔

افسانے کا آغاز وارتقا:

اردو میں مختصر افسانے کا آغاز یقیناً مغربی ادب کے زیر اثر ہوا لیکن اس کی مقامی، سماجی و ثقافتی بنیادوں سے بھی صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ بیسویں صدی کے آغاز ہی میں اردو افسانے کا چلن عام ہوا۔ ناول کی طرح افسانے کے موضوعات کا دائرہ بھی وسیع ہے۔ افسانے میں سماجی مسائل اور افراد کی ذہنی وجذباتی الجھنوں کی ترجمانی ہوتی ہے۔ انسانی زندگی کے پیچ وخم، ناآسودگی، طبقاتی کشمکش، عدم مساوات، جنسی تفریق اور بے انصافیاں وغیرہ افسانے کے اہم موضوعات ہیں۔ ابتدائی دور میں اسے سجاد حیدر یلدرم (رومانوی) علامہ راشد الخیری (اخلاقی) سدرشن (سماجی) سلطان حیدر جوش (اصلاحی) اور پریم چند (حقیقت نگاری) پر مبنی جیسے افسانہ نویس میسر آئے جنھوں نے اپنی عمدہ افسانہ نگاری سے اس صنف کو فعال اور متحرک صنف کا درجہ عطا کیا۔ اردو افسانہ نہایت مختصر سفر کر کے اپنے عہدِ زریں میں داخل ہوا جس میں سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، علی عباس حسینی، راجندر سنگھ بیدی، نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھ پوری، حجاب امتیاز علی، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، غلام عباس، احمد ندیم قاسمی، انتظار حسین اور دوسرے بڑے افسانہ نگاروں نے اس کے دامن کو رنگا رنگ افسانوں سے بھر دیا۔ ان لوگوں نے اردو افسانے کو اپنی فنکارانہ صلاحیتوں سے ایسا مالا مال کیا کہ ان کا زمانہ عروج کا زمانہ بن گیا۔

”انگارے“ کی اشاعت :

پریم چند اور ان کے معاصر افسانہ نگار اپنی تخلیقات میں مصروف تھے کہ اردو میں ایک نئی تحریک نے جنم لیا۔ ایک واضح نقطۂ نظر، ایک منشور، ایک اعلان اور ایک تنظیم کے اعتبار سے اردو میں ترقی پسند تحریک 1936ء میں شروع ہوئی۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں اردو افسانے کی مختصر سی روایت میں ایک نیا موڑ اس وقت سامنے آیا جب اس تحریک کی واضح اور منظم شکل 1932ء میں ”انگارے“ کے روپ میں منظرِ عام پر آئی جس میں کچھ نوجوان ادیبوں نے مغربی تکنیکوں اور اظہارِ بیان کی جدتوں کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے مختلف طرز کے افسانے لکھے۔ اس مجموعے کی اشاعت نے اردو افسانے کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔ اس نے کہنہ روایت کو توڑتے ہوئے افسانوں کو جہانِ نو سے آشنا کیا اور نئے فن کی بنیاد ڈالی جس میں جدید نفسیاتی محرکات، نئے معاشی نظریات، سیاست اور اقتصادی مسائل کی ہم آہنگی، مذہبی اور روحانی قدروں کی شکست وریخت، پلاٹ اور کردار نگاری جیسی فرسودہ چیزوں سے بے نیاز تھی۔ جس نے نہ صرف افسانوی ادب میں بلکہ تمام معاشرتی زندگی کو اُلٹ پلٹ کر رکھ دیا۔ اس انقلاب آفریں تاثر نے اردو افسانے کے لیے جدت کی بے شمار راہیں کھولیں۔

”انگارے“ کی اشاعت کا پس منظر:

”انگارے“ کے حساس افسانہ نگار جو جدید علوم سے آراستہ تھے، سماج سے مطمئن نہ تھے۔ وہ موجود مسائل کو وسیع تناظر میں دیکھ رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اندھی عقیدت پسندی، مصلحت پسندی، بے جا تصنع اور تکلف معاشرے کو گھن کی طرح چاٹ رہا ہے۔ بقول ڈاکٹر قمر رئیس:

> ”سیاسی غلامی، بڑھتے ہوئے افلاس، بے رحم سماجی قوانین، بوسیدہ رسم و رواج اور ان کے قیود سے یہ نوجوان ایک کرب انگیز گھٹن محسوس کر رہے تھے۔ اس کے خلاف ان کے وجود میں بیزاری اور نفرت کی آگ سی دہک رہی تھی“۔(05)

لہٰذا انھوں نے اس کے خلاف افسانوی مجموعہ ”انگارے“ کے ذریعے سخت احتجاج کیا۔ ان کے اس انقلابی عمل نے ادب کی بہت سی قدروں کو زیروزبر کر دیا۔ موضوع اور تکنیک دونوں لحاظ سے ہی اردو افسانہ میں تبدیلی آئی۔

”انگارے“ کا فکری جائزہ:

”انگارے“ کے افسانے ایک طرف حقیقت نگاری کے رجحان اور دوسری طرف رومانویت کا نیا انداز لیے ہوئے ہیں لیکن ان میں حقیقت ورومانویت ماضی سے قدرے مختلف ہے جس میں ماضی کی نرم روی، معتدل مزاجی کے برعکس ترشی، تلخی اور طنز و تضحیک نمایاں نظر آتی ہے۔ حسن و خیر کی تلاش اور سماجیت کا کوئی مقصد یہاں نمایاں نہیں ہوتا۔ مذہب، معاشرت، اخلاق، تہذیب، ثقافت اور روایات سب کو جبر کی مختلف صورتیں قرار دے کر ان سے نفرت کا اظہار کیا گیا ہے۔ بقول عزیز احمد:

> ”انگارے متوسط طبقے کے شباب کا اعلانِ جنگ ہے۔ اس میں سجاد ظہیر، احمد علی اور رشید جہاں نے ان تمام اساسی اصولوں پر حملے کیے ہیں جو بزرگوں کے نزدیک قابلِ تعظیم تھے۔ جنسی مسائل نے وہ جگہ حاصل کر لی ہے جس کا انھیں ایک حد تک حق تھا۔ ملاؤں کی جھوٹی مذہب پرستی...... ایسی جس میں ایمان کو دخل نہیں اور جو اپنے نفس کو اور دوسروں کو دھوکا دیتی ہے...... جس کی اقبال نے بھی جا بجا شکایت کی ہے...... بڑی شد و مد سے واضح کی گئی“۔ (06)

''انگارے'' کے افسانہ نگار جدید تعلیم سے آراستہ اور بیرون ملک علمی وادبی صورتِ حال سے بخوبی واقف تھے۔ بدلتا عالمی منظر نامہ اور ہندوستان کا ماضی وحال ان کی نظر میں تھا۔ ان دنوں اشتراکی نظریات ساری دنیا کے نوجوان ذہنوں میں گرمی پیدا کر رہے تھے اور تحریک کا جوش و خروش عروج پر تھا۔ ''انگارے''میں اسی جوش و خروش اور نقطہ نظر کی عکاسی ملتی ہے۔

دس افسانوں پر مشتمل اس مجموعہ میں موضوع اور فن دونوں سے انحراف ملتا ہے۔ اس کے مصنفین نے زندگی کی حقیقت کو بڑی بے باکی سے پیش کیا۔ اس میں بوسیدہ نظام، بے جان قدریں، سیاسی تحریکوں، بے رحم سماجی قوانین اور استحصال کے خلاف علم بغاوت بلند کیا ہے۔ بقول سید وقار عظیم:

> ''موضوع کے لحاظ سے اس سے پہلے اردو کے افسانوں میں اتنی صاف گوئی اور بے باکی کہیں نہیں ملتی اور نہ فن کے لحاظ سے اتنی نازک پیچیدگیاں......ان افسانوں کی سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ موضوع اور فن دونوں کے اعتبار سے انھوں نے اپنے پڑھنے والوں کو ان گنت دھچکے دیے''۔ (07)

افسانے کی دنیا میں یہ تیسرا بڑا انقلاب تھا جس کے ذریعے افسانے کو بڑی وسعت ملی اور ادب کو بڑے پیمانے پر متاثر کیا۔ ''انگارے'' سجاد ظہیر، احمد علی، رشید جہاں اور محمود الظفر کی مشترکہ کاوشوں کی نتیجہ تھا۔ اس مجموعے میں شامل نو افسانے ادبی حوالے سے اتنی وقعت نہیں رکھتے لیکن ان کی تاریخی حیثیت مسلم ہے۔ نئے زاویوں سے مزین یہ تصویریں ناپختہ ہونے کے باوجود ایک بڑی تبدیلی کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں۔ جرأت و بے باکی کی ایک منفرد روایت نے جنم لیا جس کی بدولت ادب کے تسلسل میں بھی تیزی آئی اور حقیقت و صداقت کے عمل کو بھی تقویت ملی۔

''انگارے'' کا فنی جائزہ:

دسمبر 1932 میں نظامی پریس وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ سے ایک ہزار کی تعداد میں نو افسانوں اور ایک ڈرامے کا مجموعہ ''انگارے''، 134 صفحات پر مشتمل چار افراد (سجاد ظہیر، احمد علی، رشید جہاں اور محمود الظفر) کی مشترکہ تخلیقی کاوش کے طور پر منظر عام پر آیا۔ جس میں سید سجاد ظہیر کے چار افسانے (نیند نہیں آتی، جنت کی بشارت، گرمیوں کی ایک رات، دُلاری، پھر یہ ہنگامہ) احمد کے دو (بادل نہیں آتے، مہاوٹوں کی ایک رات) رشید جہاں کے دو (دلی کی سیر، پردے کے پیچھے) اور محمود الظفر کا ایک افسانہ (جوانمردی) شامل ہے۔ یہ تمام نوجوان ادیب مذہبی انتہا پسندوں سے اکتائے ہوئے اور جذباتی طور پر انقلابی تصورات لیے ہوئے تھے۔ چوں کہ یہ تمام نوجوان تغیر پذیر عالمی ادب سے واقف تھے اس لیے ان کی کہانیوں میں تازگی اور نئے تجربے کا احساس ہوا۔ ڈاکٹر خالد علوی لکھتے ہیں کہ:

> ''یہ تمام نوجوان سماجی نظام کی عفونت اور طبقاتی عدم مساوات کو محسوس تو کرتے تھے لیکن ان کے سامنے ان مسائل کا کوئی واضح حل موجود نہیں تھا۔ معاشی خوش حالی اور اقتصادی توازن کا فقدان ان کے لیے سوہانِ روح تھا۔ لیکن شاید اس مجموعے کی اشاعت تک ان ادیبوں کی سیاسی فہم و فراست بالغ نہ ہوئی تھی ورنہ ان کہانیوں میں غلامی کی شدائد، فرنگی حکومت کے جبر و استبداد اور عوامی استحصال کا کوئی عکس نظر کیوں نہیں آتا''۔ (08)

''انگارے'' کے روحِ رواں سجاد ظہیر تھے۔ وہ لندن میں بیرسٹری کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ انھوں نے پانچ افسانے لکھے۔ ان کا افسانہ ''دلادری'' میں پلاٹ کا قدرے خیال رکھا گیا ہے۔ اس افسانے میں پہلی مرتبہ عورت کی ایسی

پیچیدگیوں کو ذکر کیا گیا ہے جسے آگے چل کر بہت سارے افسانہ نگاروں نے اپنایا۔ احمد علی کے دونوں افسانے ''بادل نہیں آتے'' اور ''مہاوٹوں کی ایک رات'' باغیانہ خیالات کے حامل ہیں۔ ''بادل نہیں آتے'' عریانی سے قطع نظر بیانیہ انداز کا ایک اچھوتا نمونہ ہے۔ ''مہاوٹوں کی رات'' سماجی برابری اور اقتصادی مسائل پر لکھا گیا ہے۔ رشید جہاں کا افسانہ ''دِلی کی سیر'' ایک مضمون نما کہانی ہے جس میں سماج میں عورتوں کی غلامی جیسی زندگی کی عکاسی کی ہے۔ رشید جہاں نے سماج میں عورتوں کی ذہنی پس ماندگی، شکست خوردگی اور بے بسی کو شدت سے محسوس کیا ہے۔ وہ ایک باغیانہ دل و دماغ کی حامل عورت تھیں۔ رشید جہاں کا افسانہ ''پردے کے پیچھے'' ایک تمثیلچہ ہے۔ مگر ''انگارے'' کے سرورق پر بھی یہ عبارت موجود ہے ''دس مختصر کہانیوں کا مجموعہ''۔ محمود الظفر کا افسانہ ''جوانمردی'' مرد کے جھوٹے پندار کو فاش کرتا ہے۔ محمود الظفر نے پہلے اسے انگریزی میں لکھا، پھر سجاد ظہیر نے صرف کتاب میں نام شامل کرنے کی غرض سے اسے اردو کا روپ دیا۔

''انگارے'' کے دس افسانوں میں اس دور کے ہندوستان کی مذہبی، سیاسی اور سماجی زندگی کی پیدا کردہ شخصیتوں کی تصویروں کی عکاسی ملتی ہے جس میں جھنجھلاہٹ اور بیزاری کا اظہار موجود ہے۔ سبھی افسانے باغیانہ خیال کے حامل ہیں۔ فنی اعتبار سے ''انگارے'' کے تقریباً سبھی افسانے کمزور ہیں۔ اکثر افسانے پلاٹ کی قید سے آزاد ہیں۔ کہانی کی ترتیب جیسی ہونی چاہیے تھے ویسی نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود اردو افسانہ نگاری کی دنیا میں اس لیے زبردست اہمیت رکھتے ہیں کہ ان سے زندگی کے مسائل کو پوری جرأت اور بے باکی کے ساتھ پیش کرنے کی ابتدا ہوئی اور کچھ ایسے موضوعات افسانے میں داخل ہوئے جو قبل ازاں نہیں تھے۔ بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی:

> ''اردو کے نوجوان لکھنے والے انھیں کی ڈگر پر چلنے لگے اور آج بھی اردو افسانہ نگاری ترقی کی اتنی منزلیں طے کر لینے کے باوجود اسی ایک راستے پر چلی جا رہی ہے جو انگارے کے لکھنے والوں نے اگر پوری طرح بنائی نہیں تھی تو کم از کم دکھائی ضرور تھی اور اس کے تمام نشیب و فراز سے آگاہ کر دیا تھا''۔(09)

ہم اس بات کو مانتے ہیں کہ ''انگارے'' کے مصنفین نے فنی اعتبار سے کوئی بڑا کارنامہ انجام نہیں دیا لیکن پرانی روایت کو توڑ کر نئی روایت کی بنیاد ضرور ڈال دی جس سے نئی نسل کو آگے بڑھنے کے لیے نیا راستہ اور روشنی ملی۔

''انگارے'' پر ردِ عمل اور پابندی:

دسمبر 1932ء میں لکھنؤ سے ''انگارے'' شائع ہوئی تو یہ ایک ہنگامہ خیز کتاب ثابت ہوئی۔ گویا ایک پنڈورا بکس کھل گیا۔ اس کے نوجوان مصنفین جانتے تھے کہ ادبی میدان میں ہی نہیں سیاسی و سماجی بالخصوص مذہبی حلقوں میں شدید ردِ عمل ہو گا مگر جس پیمانے پر انھیں گالیاں پڑی اور دھمکیاں ملیں انھیں شاید اس کا اندازہ نہیں تھا۔ تقریباً سارے رسائل و جرائد اور چھوٹے بڑے تمام روزناموں نے اس کی مذمت میں اداریئے لکھے اور مضامین شائع کیے۔ اسے دل آزار اور فحش کتاب قرار دے کر پرزور مذمت کی گئی جس میں خدا اور اس کے پیغمبروں کا مذاق اڑا کر تمام مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی گئی ہے اور جو مذہب اور اخلاقیات دونوں کے نقطہ نظر سے انتہائی قابل اعتراض بات تھی۔

ڈاکٹر انوار احمد لکھتے ہیں کہ:

> ''انگارے میں مذہبی قدامت پسندی، تنگ نظری اور موقع پرستی کے ساتھ ساتھ بالائی طبقات کے سیاسی رویوں اور تضادات، یعنی حفظِ اخلاق اور بوالہوسی، انسان دوستی اور عورت کی تذلیل پر مبنی مردانگی، رعایا پروری اور رعایا سے سے ہی کراہت

کو شعوری طور پر ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے مگر مسلمانوں کے بنیادی معتقدات (خدا، رسول اور فرشتے) جس تضحیک کا نشانہ بنے ہیں وہ محض جھنجھلاہٹ اور جذباتیت کی پیداوار ہے''۔ (10)

ڈاکٹر خالد علوی ''انگارے'' میں لکھتے ہیں کہ :

''حافظ مولوی ہدایت حسین ممبر یوپی کونسل نے گورنر کی کونسل میں ''انگارے'' کے خلاف آواز اٹھائی اور کتاب کو فحش اور ایک خاص فرقہ کے لیے دل آزار ثابت کیا۔ جن اخبارات نے ''انگارے'' کے خلاف مضامین لکھے، وہ حسبِ ذیل ہیں: ہفت روزہ سچ لکھنؤ، ہفت روزہ سرفراز لکھنؤ، راستی بارہ بنکی، ہمدم لکھنؤ، نوید لکھنؤ، روزنامہ خلافت لکھنؤ، آزاد لاہور، رہبر حیدر آباد دکن، شیرازہ بارہ بنکی، مخبرِ عالم مراد آباد، روزنامہ حقیقت لکھنؤ اور ایک انگریزی روزنامہ اسٹار الہ آباد نے بھی ''انگارے'' کو قابلِ مذمت تخلیق قرار دیا''۔ (11)

ڈاکٹر سلیم اختر ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' میں لکھتے ہیں:

''علما کرام نے کتاب اور اس کے تخلیق کاروں کے خلاف منبروں کو پلیٹ فارم کی طرح استعمال کرنا شروع کیا اور فتوؤں کی بوچھاڑ کر دی۔ صوبہ جات متحدہ کی اسمبلی میں اس پر سوال اٹھائے گئے اور کتاب کی ضبطی کے مطالبات کیے گئے۔ کتابچے شائع کیے گئے جن میں مصنفین کو ہدفِ ملامت بنایا گیا۔ قانونی چارہ جوئی کر کے سزا دلانے کے سلسلہ میں مقدموں کے لیے فنڈز جمع کیے گئے۔ مصنفین کو سنگسار کرنے اور پھانسی پر لٹکانے تک کی مانگ کی گئی۔ کتب فروشوں نے اس ڈر سے کہ ان کے کاروبار پر اثر پڑے گا، کتاب کے تمام نسخے پبلشر کو واپس کر دیے تھے''۔(12)

آخر کار حکومت صوبہ جات متحدہ نے 15 مارچ 1933ء کو تعزیرات ہند کی دفعہ 99 کے تحت کتاب کی ضبطی کا حکم دے دیا۔ ملک گیر مخالفت اور ضبطی کی وجہ سے ''انگارے'' کو خصوصی اہمیت حاصل ہو گئی اور آزادیِ اظہار، بغاوت اور مسلمات کے خلاف احتجاج کے لیے اس نے علامت کی صورت اختیار کر لی۔ ترقی پسند افسانہ نگاری کے لیے اس نے ایک طرح سے معیار اور پیمانہ کی صورت اختیار کر لی۔ یہی نہیں بلکہ ہر ترقی پسند افسانہ نگار کے تحت الشعور نے ''انگارے'' کے افسانوں کی مانند بے باک حقیقت نگاری کو اپنا مقصودِ فن بنا لیا۔

یہ کتاب پابندیوں اور اعتراضات کے باوجود بھی اردو افسانے کی روایت میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہو گئی اور آج بھی اسے ایک نئے تجربے کی یادگار کے طور پر اس کا ذکر کیا جاتا ہے۔

حوالہ جات

01۔ انور جمال، ڈاکٹر، ''ادبی اصطلاحات''، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۲۰۱۹، ص ۲۴

02۔ وقار عظیم، پروفیسر، ''داستان سے افسانے تک''، اردو اکیڈمی سندھ کراچی، ۱۹٦٦، ص ٦١

03۔ وقار عظیم، سید، ''افسانہ نگاری''، سرسوتی پبلشنگ ہاؤس الہ آباد، ۱۹۳۵، ص ۲۱

04۔ وقار عظیم، سید، ''افسانہ نگاری''، سرسوتی پبلشنگ ہاؤس الہ آباد، ۱۹۳۵، ص ۳۱

05۔ قمر رئیس، ڈاکٹر، ''پریم چند کی روایت''، الفاظ افسانہ نمبر، جلد اول، شمارہ جنوری تا اپریل ۱۹۸۱ء، ص ٦

06۔ عزیز احمد، ''ترقی پسند ادب''، کاروانِ ادب ملتان، ۱۹۸٦، ص ٦۵

07۔ وقار عظیم، سید، ''نیا افسانہ''، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ص ۰٦

08۔ خالد علوی، ڈاکٹر، ''انگارے''، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۱۳، ص ۹۱

09۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، ''اردو افسانے کا ایک مضمر رجحان''، مطبوعہ چمنستان دہلی، افسانہ نمبر، جون ۱۹٦٤، ص ۸۴

10۔ انوار احمد، ڈاکٹر، ''اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ''، کتاب نگر، ایس ایس مال نصرت روڈ، ملتان کینٹ، ۲۰۱۷، ص ۲۱۱

11۔ خالد علوی، ڈاکٹر، ''انگارے''، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۱۳، ص ۲۱

12۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ''، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۸، ص ۹۳۴

★★★★★

منیر فراز

راجندر سنگھ بیدی؛اردو افسانے میں کردار نگاری کا بادشاہ

ایک تو اس کا نام بڑا رومانوی تھا جیسے میر کے کسی دلآویز شعر کی تقطیع کی گئی ہو۔ راجن در سنگھ بیدی یا موسیقی کے سُر، سارے گاما پادا۔ آپ کو نہیں لگتا، جیسے سنگ مرمر کے فرش پر شری کرشن کی مورتی کے سامنے وجد کے عالم میں رقص کے دوران میرا کے گھنگرو ٹوٹ کر دور تک لڑھکتے چلے گئے ہوں، راجن در سنگھ بیدی۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ان آبادیوں کے گلی نمبر نہیں ہوا کرتے تھے، بس گلیاں ہوتی تھیں جو کسی نہ کسی نام سے مشہور ہوا کرتی تھیں۔ یہ کراچی کے گول بنگلہ کی گلی تھی اور یہاں سے ہر دوسری تیسری شام ایک کباڑیہ اپنی شکستہ ریڑھی کے ساتھ گزرا کرتا تھا، ادریس کباڑیہ، یہ نائلون کی پرانی چپلوں، پلاسٹک کے ٹوٹے برتن، اخبار، کتب ورسائل کی ردی اور لوہے پیتل کے ٹکڑوں کے عوض اپنے گاہکوں کو کچھ پیسے یا ''بارٹر سسٹم'' کے تحت ان کے مساوی ریڑھی پر ایک کونے میں رکھی مٹھائی اور ان پر بھناتی ہوئی مکھیاں دیا کرتا تھا۔ میں اس کے آنے تک اپنے آبائی کارخانہ سے لوہے کے کچھ اضافی ٹکڑے جمع کر لیا کرتا تھا جن کے عوض میں ادریس کباڑیہ سے اس کی ریڑھی کے ردی کے ڈیپارٹمنٹ سے، اگر دستیاب ہوتیں تو کچھ کتابیں یا رسائل خرید لیا کرتا تھا۔ میری لائبریری میں طفیل احمد کے ''نقوش'' کا افسانہ نمبر، غزل نمبر، سالنامہ، سجیلے اختر شیرانی کا شعری مجموعہ ''لالہ طور''، نشیلے عدم اور ساحر کی چند کتب اسی ادریس کباڑیہ کی یادگاریں ہیں۔ میں نے اس کمبخت میر کے دلآویز شعر کی تقطیع اور گھنگروؤں کے تمثیلی نام والے راجندر سنگھ بیدی کو پہلے پہل نقوش کے اسی افسانہ نمبر میں پڑھا تھا اور افسانہ تھا ''اپنے دکھ مجھے دے دو''۔ اردو فکشن میں کردار نگاری کے حوالے سے میرا پہلا تعارف اسی افسانہ کی ''اندو'' سے ہوا، مشرقی روایت، ایثار و محبت اور پنجاب کی مٹی سے گندھی اندو، میں اب یہ افسانہ بھول چکا ہوں لیکن اندو مجھے آج بھی یاد ہے۔ خاندانی روایتوں کے دکھ سہتی اندو، اس کے افسانوں کے تمام کردار اسی طرح یاد رہ جانے والے ہیں۔ اختر شیرانی کی نظمیں ''ننھا قاصد'' اور ''اودیس سے آنے والے بتا'' بھی اسی دور سے یوں حافظے سے چپکی ہوئی ہیں جیسے مجھے اس دور کے پہاڑوں کی ٹون آج بھی یاد ہیں۔ دو اکیم دو، دو دونی چار، اودیس سے آنے والے بتا! کس حال میں ہیں یارانِ وطن۔

میں یہاں بیدی کے فن پر تنقیدی مضمون نہیں لکھ رہا، تنقیدی مضامین کتابوں میں اچھے لگتے ہیں۔ بس مجھے وہ اچھا لگتا تھا، صرف یہ بتانا چاہتا ہوں۔ کیوں بتانا چاہتا ہوں، یہ بھی نہیں پتا، شاید وہ ستمبر میں پیدا ہوا تھا اور مجھے ستمبر میں وہ یوں ہی یاد آ گیا۔ یا شاید محبی یاسر حبیب نے حال ہی میں اس کا ایک افسانہ ''گرم کوٹ'' پوسٹ کیا اور مجھے وہ یاد آ گیا۔

میں بیدی کی نثر اور اس کی شخصیت کا عاشق ہوں اور اپنے محبوب کی چند باتیں کرنے بیٹھ گیا ہوں اور یہ جو ''عالمی ادب کے اردو تراجم'' والا گھرانہ ہے اس کے افراد خانہ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں، یہ بات کرتے ہیں، سنتے ہیں، سمجھتے ہیں، رائے دیتے ہیں۔ تو میں آپ سے کہہ رہا تھا یہ جو کرتے کے رنگ سے میچ کرتی پگڑی پر کلف اور کپڑوں پر دیسی خوشبو لگا کر ادبی محفلوں میں آخری نشست پر بیٹھتا ہے اور ہاتھ لہرا لہرا کر حفیظ جالندھری کے شعروں پر داد دیتا ہے، ساحر لدھیانوی اور مجاز سے عید پر گلے ملتا ہے اور کرشن چندر پر ہولی کے روز رنگ پھینکنے چلا جاتا ہے اور گھر میں گرونانک کی ''جپ جی صاحب'' کو پڑھتا ہے۔ یہ بیدی میرا محبوب ہے اور یہ جو دن میں خاکی وردی پہن کر ڈاک کے لفافوں پر مہریں لگاتا رہتا ہے اور شام کو چکنی

مٹی اور توڑی کے آمیزے سے تیار کیے گئے گارے سے لپے صحن میں بیٹھ کر اسی چکنی مٹی اور توڑی کے گھروں کی کہانیاں لکھتا ہے، مجھے اس کی نثر سے پیار ہے۔

میں آپ کو اپنے محبوب کی چند یادگار تصویریں دکھانا چاہتا ہوں۔ ریڈیو پر اسکرپٹ رائٹر کی آسامی ہے، کم سے کم تعلیم گریجویشن ہے ایک خستہ حال انٹرمیڈ ٹیا انٹرویو کے لیے ادب کے دیو ہیکل اور آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر پطرس بخاری کے سامنے بیٹھا ہے، ابھی انٹرویو مکمل نہیں ہوتا اور یہ دیو ہیکل اٹھ کر خستہ حال انٹرمیڈ ٹیا بیدی کو گلے لگالیتا ہے۔ یہ گلے لگانا گویا تقرر نامہ ہے۔ سچ بتایئے، پطرس بخاری جسے گلے لگالے، مجھے اس کا عاشق نہیں ہونا چاہئے ؟

سن سینتالیس کے فسادات کا زمانہ ہے ایک مسلم گھرانے کو چند فسادیوں نے گھیر رکھا ہے ایک بانکا اپنے سردار دوست کے ساتھ آرمی کی وردی پہن کر فسادیوں کے درمیان گھس جاتا ہے، فوجی کی ایکٹنگ کرتا ہے اور مسلم گھرانے کی ماؤں بہنوں کو صاف بچالے جاتا ہے۔ یہ او ہنری یا اگا تھا کرسٹی کی کسی کہانی کا کردار نہیں ہے، یہ ''ہاتھ ہمارے قلم ہوئے'' والا بیدی ہے اور یہ اس کا افسانہ نہیں، اس کی شخصیت ہے۔

آپ نے دلیپ کمار کی ''دیوداس'' یا ''داغ'' دیکھی ہو اور دلیپ کمار کے سر کو دائیں بائیں حرکت دے کر جذباتی اور رومانوی مکالموں کی چاشنی سے لطف اندوز ہوئے ہوں تو ان کے پیچھے بیدی ہی کا قلم تھا۔ بمل رائے کی ''مدھومتی'' کی محبت کی ماورائی کہانی میں اگر آپ گم ہو گئے تھے اور آپ نے فلم ''مرزا غالب'' کی ثقیل و شائستہ اردو کا لطف اٹھایا ہے تو میں آپ کو بتادوں کہ یہ ''دو کھ جلی'' کا خالق بیدی ہی ہے۔ مکالمہ، تمثیل، افسانہ، ڈرامہ یا ہدایات، وہ ہر شعبہ میں یکتا نظر آتا ہے۔ اس کے بے مثال ناول ''ایک چادر میلی سی'' کو بڑی شہرت ملی۔ خشونت سنگھ نے ITakethiswoman کے نام سے انگریزی میں ترجمہ کر کے دنیا کے عالمی ادب کی لائبریریوں تک پہنچایا اور پاکستان کی خاتون ہدایت کارہ سنگیتا نے اسے ''مٹھی بھر چاول'' کا نام دیکر فلم میں ڈھالا۔

اب ایک ایسا شخص جو تپ دق میں مبتلا اپنی ماں کے بستر سے لگا رہتا تھا اور اس کی تمام ضروری حاجتیں اپنے ہاتھوں سے پوری کرتا تھا، اس کے کپڑے دھوتا تھا، اس کے بال بناتا تھا۔ ایسا شخص اگر کہانیاں لکھنے بیٹھے گا تو بتایئے کیا لکھے گا؟ بس یہی اس کی کہانیوں کا مرکز تھا جو ابھی ابھی آپ کے ذہن میں ابھرا۔ اس کے پاس بس یہ دو طلسم ہی تھے، اس کا مشاہدہ اور تخیل۔ اب آپ بیدی کو پڑھیں گے تو اس کی ہر کہانی میں اس کی شخصیت کے یہ پہلو واضح نظر آئیں گے۔

اپنے وقت کے کسی ارب پتی تاجر سے کسی نے سوال کیا کہ آپ کی خواہشات کیا ہیں؟ تو تاجر نے جواب دیا: میں ایک بار اس شخص سے ملنا چاہتا ہوں جس نے میری کسمپرسی کے دنوں میں جب میں جوے میں اپنا آخری داو ہار چکا تھا، ایک ڈالر قرض دیا جس کی بدولت میں جیتتا چلا گیا اور ایک کامیاب بزنس کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہوا۔

میں اگر اپنی زندگی کے کچھ ایسے گمشدہ لوگوں سے ملنا چاہوں گا تو اس فہرست میں رومانوی نام والا ادریس کباڑیہ بھی ضرور آئے گا، جس نے مجھے پہلے پہل راجندر سنگھ بیدی سے ملوایا۔ راجندر سنگھ بیدی، جیسے میر کے کسی دلآویز شعر کی تقطیع کی گئی ہو۔ جیسے شری کرشن کی مورتی کے سامنے وجد کے عالم میں رقص کے دوران میرا کے گھنگرو ٹوٹ کر دور تک لڑھکتے چلے گئے ہوں۔ راجن در سنگھ بیدی

★★★★★

تنزیلہ شبیر

خورشید بیگ میلسوی کی نعت گوئی

اسلامی فکر کے مطابق ایک سچا مسلمان ہونے کے لیے صرف اللہ اور توحید پر ایمان و یقین کافی نہیں بلکہ مقصودِ کائنات، پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ محبت و عقیدت اور رسالت کا اقرار بھی لازمی امر ہے۔ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے ساتھ جذبۂ خلوص اور والہانہ عشق کا اظہار ہر صاحبِ ایمان کے لیے ضروری ہی نہیں بلکہ اصل ایمان کی حیثیت رکھتا ہے۔ سید المرسلین، نبی آخر الزماں ﷺ کا ذکرِ خیر کرنا جو باعث ہے برکتوں، رحمتوں اور نجات کا اور نعت ذاتِ رسالت مآب ﷺ کے محاسن کا، حضور ﷺ کی سیرت پاک کے مختلف پہلو، آنحضرت ﷺ کی تعلیمات اور سراپا مبارک کے مختلف خصائص اور آپ ﷺ سے محبت و شیفتگی کی واردات و کیفیات کا اظہار ہے۔ ہر دور میں حضور ﷺ سے عشق و عقیدت کا اظہار کرنے والے پیدا ہوئے جو نعت کی صورت اپنی عقیدت اور عشق کا اظہار کرتے رہے۔ دورِ جدید میں بہت سے نامور شخصیات نے نعت گوئی میں ایک الگ مقام حاصل کیا۔ ان شخصیات میں ایک نام خورشید بیگ میلسوی کا بھی ہے جنھوں نے نعتیہ ادب میں ایک مخصوص مقام حاصل کیا۔

خورشید بیگ میلسوی اردو کے ایک ممتاز و معتبر شاعر ہیں۔ ان کے غزلیات کے کئی مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ ان کے قلم سے عقیدت نگاری کی ایک قوسِ قزح پھوٹی جو حمد و نعت میں اپنے مخصوص رنگ سے پہچانی جاتی ہے۔ ان کا ایک نعتیہ مجموعہ منظر عام پر آچکا ہے ''جمالِ نظر''، اس نعتیہ شعری مجموعے پر انہیں صدارتی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ ان کا دوسرا نعتیہ مجموعہ ''محرابِ نعت'' اشاعت کے مراحل میں ہے۔ ان کی نعت میں بیان کی لطافت کے ساتھ ساتھ موضوع کی وسعت اور گہرائی کا احساس بھی شعری تجربے میں اس طرح آمیزہ ہو گیا ہے کہ پڑھنے والا اس سے اُبھرتی فضا میں خود کو جذب ہوتا ہوا محسوس کرتا ہے۔

نعت گوئی کی اساس تو جذبے کی صداقت اور والہانہ عقیدت پر استوار ہے مگر جذبے کے پُر تاثیر اظہار کے لیے فنی ریاضت اور حسنِ اسلوب بھی درکار ہے اور ان کی شاعری میں ان تمام عناصر کے امتزاج سے وجود میں آنے والے دل نشین اشعار جا بہ جا نظر آتے ہیں۔

محمد مصطفیٰ کا ذکر چھیڑوں اور دہن مہکے　　　سلیقہ نعت کہنے کا ملے، طرزِ سخن مہکے
اِسی اک اسم سے مانوس میرے گھر کے گل بُوٹے　　　درودِ پاک پڑھتے ہی مرا سارا چمن مہکے

ان کی شاعری میں جذبہ و مستی اور کیف آفرینی نمایاں محسوس کی جاسکتی ہے۔ ان کے کلام میں برجستگی اور سلاست و روانی ہے۔ خورشید بیگ نے نہایت خلوص اور دل کی گہرائی سے نعتیں کہی ہیں اور جب خلوص اور قلبی لگاؤ کسی تخلیق میں شامل ہو جائیں تو تخلیق کا موثر ہونا لازمی ہے۔ انھوں نے اپنی نعت کی بنیاد تخلیقیت، تازگی، روایت سے گریز اور نئے نئے مضامین کی تلاش و جستجو پر رکھی۔

تیرے کردار نے انساں کو بنایا انسان　　　تیری تعلیم نے تہذیب کی نعمت بخشی
آدمیت تیری مرہونِ نظر ہے اب بھی　　　نوعِ انسان کو تہذیب سکھانے والے!

عقیدت و مودت کے اظہار کے ساتھ حسنِ ادا کا خیال بھی رکھا گیا ہے۔ حضور ﷺ سے اظہارِ محبت اور قلبی واردات کو جس پیرایۂ اسلوب میں بیان کرتے ہیں وہ یقینا ممتاز بھی ہے اور منفرد بھی۔امجد اسلام امجد ان کی نعتیہ شاعری کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں:

> ''خورشید بیگ میلسوی کی نعتیہ شاعری ان تمام اوصاف سے مملو ہے جن سے جدید نعت پہچانی جاتی ہے۔ان کے کلام میں عشقِ نبی ﷺ، سوز و گداز اور اظہارِ عقیدت کے گوناگوں رنگ پائے جاتے ہیں''

خورشید بیگ صاحب کی نعتیہ کلام کا مطالعہ کرتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ اُن کی سوچوں کا محور و مرکز فقط دیار مصطفیٰ ہے،ان کی نعتیہ شاعری میں حضوری تڑپ، مدینہ منورہ سے دوری اور وابستگی، قرآنی مفہام سے مزین مصرعے اور پیغامِ سیرت طیبہ کا اُجالا جابجا منعکس ہوتا دکھائی دیتا ہے۔

میں اپنا ہدیہ جذبات لے کے آیا ہوں قبولیت کا شرف ہو عطا اسے آقاؐ

عشقِ مصطفیٰ ﷺ ہو یا عقیدتِ مصطفیٰ ﷺ، خورشید بیگ میلسوی کے لیے یہ رہنمائی کا سرمایہ و اثاثہ ہے اور عملِ خیر و اُخروی نجات کا سامان ہے۔

ایک پیارا دل اور حساس جذبوں کے مالک خورشید بیگ میلسوی صاحب اس دارِ فانی سے 12 اکتوبر 2020ء بروز اتوار اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ نعتیہ ادب کا یہ چراغ بجھ گیا۔بے شک دنیا فانی ہے مگر ان کی لکھی نعت اور حضور ﷺ سے عشق و محبت امر ہو گئی۔اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

★★★★★

افسانہ نویس: شاہین کاظمی

پیار، پیاز اور پیلار بن

بہت کچھ اَن کہا، اَن سنا تھا۔ لمحے پھسلے تو دکھ اندر اتر کر برف کی ڈلی بن گیا۔ سیک کون دیتا؟ آنکھ اور من دونوں بنجر ہو گئے۔

''تم چاہتی ہو دکھوں کا میلہ لگایا جائے؟'' کسی کو اِس میں دلچسپی نہیں۔ ہر ایک اپنے جہنم میں بھٹک رہا ہے سائے کی تلاش میں۔

''دیوانگی کی انتہا'' میری ہنسی میں استہزاء تھا۔

''سائے بھی بھلا کبھی اپنے ہوئے ہیں''

''اور سنو! اِس کہنے سننے کی وحشت سے جتنی جلدی باہر نکل آؤ اتنا بہتر ہو گا''۔

''تم اتنے بے رحم کیسے ہو سکتے ہو؟''

''کہنے سے دکھ ہلکے ہوتے ہیں''۔

''محض خام خیالی ہے تمہاری''۔ میں پھر سے ہنسا۔

''خود سے محبت میرا پہلا اصول ہے۔ اور اپنی ذات تک محدود رہنا دوسرا''

''میں تمہاری زندگی میں کہاں ہوں؟'' وہ چڑ گئی۔

مشرقی دیوار والی کھڑکی کے چھجے پر بیٹھا کبوتر غڑغوں کرنے لگا تھا۔ میں نے نظر بھر کر کبوتر کو دیکھا اور پھر مسکرا کر اُس کی طرف پلٹا:

''محبت اپنے ہونے کا جواز کیوں چاہتی ہے؟''

''مجھے تمہاری کسی فضول بات کا جواب نہیں دینا'' اُس کی کتھئی آنکھوں سے ناراضی کا گہرا رنگ چھلکنے لگا۔

''حیات خانم!'' میں نے لپک کر اُس کا ہاتھ تھام لیا۔

''جب الفاظ اور لہجے اندر پنپنے والا احساس بیان کرنے سے قاصر ہوں تو ناگفتنی گفتنی سے زیادہ تاثیر رکھتی ہے''۔

صبح کی اوس میں بھیگے کنول جیسا حسن، میرے ہاتھ کی پوروں تلے اُس کی سانسوں کا زیر و بم۔۔۔! میں نے آنکھیں موند لیں۔ میں جانتا تھا لمحوں میں زندگی نہیں کی جا سکتی لیکن کچھ لمحوں کو اپنا یا تو جا سکتا ہے۔ اِن میں بہتی زندگی کی بوند بوند خشک حلق میں انڈیل کر کم از کم پیاس کو تسکین تو تھمائی جا سکتی ہے۔

''پیاس''، میں پھر سے اُلجھ گیا اور ہاتھ میں تھاما برش ایک طرف رکھ دیا۔ وہ ابھی تک ناراض تھی۔ دوڑنے کی کوشش میں میں اکثر راستہ بھول جاتا تھا لیکن اب کی بار ایسا ہوا کہ میں کانٹوں میں اُلجھ گیا۔ شاید پکی عمر کی محبت ہوتی ہی ایسی ہے۔

''ہم کیوں ایک نہیں ہو سکتے؟''، میں اُس کے اِس سوال سے ہمیشہ خوف زدہ رہتا تھا۔ شاید اِس لیے کہ میں اچھی طرح جانتا تھا میرے پاس اِس سوال کا کوئی جواب نہیں۔

عمر بھر چاہتوں کی تلاش میں بھٹکنے والا میں زمن سلمانی، مجھے پناہ ملی بھی تو کہاں! میں نے مختلف رنگوں میں ڈوبی اپنی

انگلیوں کی پوروں کو دیکھا۔ میرے اندر بڑھتی پیاس مجھے اکثر خوف زدہ کر دیتی تھی۔ کچھ پانے کی پیاس، کچھ کھوجنے کی پیاس!

ایک دم وہ میرے سامنے آ گئی۔ اپنے تمام تر آدرشوں کی پروا کیے بنا، لمحہ بھر کی تاخیر کے بغیر میں اُس کے سامنے دو زانو تھا۔ میری تلاش اتنی سطحی نہیں ہو سکتی تھی کہ میں حسن سے ہار جاؤں۔ وہ تو یُگوں سے میرے اندر بسی تھی۔ میری روح میں اُتری ہوئی، میرے لہو کے ساتھ بہتی ہوئی! لیکن تلاش مکمل ہونے پر بھی تشنگی جوں کی توں رہی، اپنی تمام تر شدت کے ساتھ! ادھورے پن کا احساس کبھی نہ مٹ سکا۔ اوائل عمری کا خواب بالوں میں سفیدی اُترنے تک دل کے کسی کونے میں پلتا رہا۔ اُجلے اور روشن رنگوں کی تعبیر کا منتظر! جب تعبیر نظر آئی تو وقت مجھے کسی اور راہ پر ڈال چکا تھا۔

میں نے ایک بار پھر سے برش تھام لیا اور ایزل پر چڑھے کینوس پر بے مقصد لکیریں کھینچنے لگا۔ زندگی میں بے مقصدیت در آئے تو کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ حتیٰ کہ اُس کی لو دیتی آنکھیں بھی اِس پاتال سے نکالنے میں ناکام رہتی ہیں۔

''زمن۔۔۔!'' سادہ کینوس پر گہری پیلی لکیروں کے درمیان سے جھانکتی کھٹئی آنکھیں۔۔۔۔ میں نے اُسے ساتھ لپٹا لیا۔

''محبت اپنے ہونے کا جواز نہیں چاہتی''۔ اُس کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''یقین رگوں میں بہتے لہو کی طرح ہوتا ہے۔ اِس یقین کو مرنے مت دینا'' اُس کی سانسوں کی مہک میرے نتھنوں میں اُتر رہی تھی۔

مجھے لگتا تھا میں اِس زمانے کا آدمی نہیں ہوں۔ میں نے کسی اور یُگ میں جنم لیا ہے۔ اِس لیے اِس عہد کے قوانین مجھ پر لاگو نہیں ہوں گے۔ لیکن کسی الہام کی طرح اُترنے والی اِس محبت نے مجھے حقیقت کی سنگلاخ زمین پر لا پٹخا۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا میں بھی اِسی دنیا کا آدمی ہوں، رشتوں، قدروں اور اُصولوں میں جکڑا ہوا۔ میرے اپنے اصول بھر بھری مٹی کی طرح میرے ہاتھوں سے پھسلتے چلے گئے۔

''مجھے اپنا بناؤ گے؟'' اُس کی کتھئی آنکھیں مجھ پر مرکوز تھیں۔ میں جو صدیوں کی جستجو کے بعد اُسے کھوج پایا تھا، اَن دیکھی زنجیروں میں جکڑا ہوا بے بسی سے اُسے دیکھتا رہ گیا۔

''تم نے جواب نہیں دیا'' اُس کی بھیگی ہتھیلیاں میرے ہاتھوں میں آنچ دینے لگیں۔ محبت کرنا اور کرتے چلے آسان ہے لیکن اِس محبت کو سماج کی تائید حاصل ہونے تک کا معرکہ جان لیوا ہوتا ہے۔

میرے ہاتھ تیزی سے کینوس پر چل رہے تھے۔ گہرے اور بھرپور اسٹروکس میں پھیلتا پیلا رنگ، پشمینے کی گرم شال کا سا لمس لیے ہوئے۔ کاش میں جواب دے پاتا یہ محبت پیاز جیسی کیوں ہوتی ہے؟ تہہ دار اور تلخ، کاٹتی ہوئی، ڈستی ہوئی کینوس پر رنگ بکھرتے رہے لیکن تصویر مکمل نہ ہو سکی۔ شاید کچھ تصویریں اُدھوری رہنے کے لیے ہی ہوتی ہیں۔

''کیا رشتوں اور دوسری محبتوں کے بندھن اتنے مضبوط ہوتے ہیں کہ انسان اپنی روح کے آگے سرنگوں ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے؟'' میں آقائی سرمد اہوازی کے حجرے میں تھا۔

''کیا محبت کرنا جرم ہے؟''

''ہرگز نہیں!''

''کیا بہت کچھ کھونے کا ڈر جنت سے دور کر دیتا ہے؟'' میرے سوال ختم نہیں ہوئے۔

''جنت کیا ہے؟'' آقائی سرمد نے میری طرف دیکھا۔

''عزیزی! جنت اور جہنم ہمارے اندر بستے ہیں اصل سوال یہ ہے کون سا دروازہ کھولنا ہے اور کون سا بند رکھنا ہے''

''کیا یہ اپنے اختیار میں ہوتا ہے؟'' میں بے چین ہو گیا۔

''شاید نہیں'' آقائی کا جواب ہمیشہ کی طرح مختصر تھا۔
''شاید ہاں!''
''تو آپ کو بھی یقین نہیں'' میری آواز میں حیرت تھی۔
کوئی ایک کمزور لمحہ ہم سب کی زندگیوں میں ہوتا ہے جب یقین شک کی زد میں آجاتا ہے۔
''پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟''
''کیا کر سکتے ہو؟'' موٹے شیشیوں کی عینک کے اُس پار سے جھانکتی اُن کی آنکھیں مجھ پر مرکوز تھیں۔
''کچھ بھی ترک کرنے کا یارا نہیں'' میں نے بے بسی سے سر جھکا دیا۔
''چلتے رہو جب تک قدم ساتھ دیتے ہیں''۔
''ہجر سے اندر گھلتا رہتا ہے'' میری آواز رندھ سی گئی۔
''کیا محبت محض پانے کا نام ہے؟''
''مگر وہ۔۔۔؟'' میں نے سوال ادھورا چھوڑ دیا۔
''محبت سود وزیاں کب دیکھتی ہے، محبت تو بس محبت ہے، ہوتی ہے یا نہیں ہوتی''
آقائی سرمد خاموش ہو گئے۔ لیکن میں اپنے اندر اُگتے شور کو بڑھنے سے روک نہ سکا۔

میں زمن سلمانی مشہور نقاش جس کی انگلیاں رنگوں میں زندگی پھونک دیتی تھیں کبھی بھی اتنا بے بس نہیں ہوا تھا۔ مجھے کہنے میں کوئی عار نہیں کہ میں آسودہ زندگی گزار رہا تھا۔ میرا گھر، بیوی، بچے، شہرت دولت اور میرا ہنر۔ لیکن اُس مغربی کھڑکی کے شیشے کے اُس پار سڑک کے دوسرے کنارے پر کھڑی حیات نجدی نگاہوں میں ایسی کھبی کہ میں اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھا۔

میں اپنا خواب اپنے آپ سے بھی چھپائے خود کو سمجھانے میں کامیاب ہو چکا تھا مگر اُس نے ہاتھ بڑھا کر ایک دم مجھے میرے اپنے اندر سے نکال لیا اور میں مزاحمت تک نہ کر پایا۔ لیکن جلد ہی وہ مغربی کھڑکی ویران ہو گئی۔ چھ ماہ قبل اپنے باپ سے ورثے میں ملا مکان اُس نے صرف اِس لیے فروخت کر دیا تھا کہ وہ پرانے فیشن کا تھا۔ اور یوں نگاہوں کا رابطہ بھی مفقود ہوا۔

''کیا عشق کسی خاص عمر کا محتاج ہوتا ہے؟'' میرے سُن ہوتے ذہن میں سوال بھرے ہوئے تھے۔
دنیاداری کا فلسفہ اور ہے۔ یہاں ایک کے بعد دوسرا عشق کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ لیکن میں نے دوسرا عشق کیا ہی کب تھا؟ وہ تو میرا پہلا عشق ہی تھی۔ اولین عشق، جس کی کسک نے مجھے عمر بھر سنبھلنے نہیں دیا۔ میں دیوانہ وار اُسے کھوجتا رہا، جب وہ سامنے آئی تو مجھے لگا میری تلاش تمام ہوئی۔ میں کب جانتا تھا کہ عشق میں کچھ بھی مکمل نہیں ہوتا۔ کبھی بھی مکمل نہیں ہوتا۔ اور عمر کے اِس حصے کا عشق تو اور بھی گھائل کرتا ہے۔
رُلاتا ہے، جھنجھوڑ ڈالتا ہے اور انسان بے بسی سے پاؤں میں پڑی بیڑیوں سمیت عشق کے خار زار میں گھسٹتا رہتا ہے۔
کیا تھا اگر وہ مجھے پہلے ملی ہوتی تو؟ میں نے اپنی آنکھوں میں نمی اُبھرتی ہوئی محسوس کی لیکن کیا واقعی عشق صرف پانے کا نام نہیں؟ کیا عمر بھر سلگتے رہنا ہی عشق کا مقدر ہے؟ مغربی کھڑکی کے اُس پار ویران سڑک جیسے میرے اندر اُتر آئی تھی۔

اٹلی کے شہر فلورینس میں ہونے والی فنونِ لطیفہ کی عالمی نمائش میں مجھے، زمن سلمانی کو میری پینٹنگ ''انتظار'' پر

پہلے انعام کا حقدار قرار دیا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ پینٹنگ لاکھوں روپوں میں فروخت بھی ہو گئی لیکن میرے دل میں ٹھہرا سکوت نہ ٹوٹ سکا۔

میں نے آخری بار پینٹنگ کو دیکھا۔ کتھئی آنکھوں والی اُداس لڑکی بالوں میں پیلا ربن لگائے ویران راستے پر نظریں جمائے کھڑی تھی۔

فوجی محاذِ جنگ پر ہوں یا زندگی کی جنگ میں، واپسی کا لمحہ اُن کے اپنے ہاتھ میں نہیں ہوتا۔ اُن کے دل، جسموں سے بہت دور کہیں اور دھڑک رہے ہوتے ہیں اور اِن دلوں میں بسنے والیاں یونہی بالوں میں پیلے ربن اٹکائے راستوں پر نظریں گاڑے بالوں میں چاندی اتار لیتی ہیں لیکن انتظار تمام نہیں ہوتا۔ محاذِ جنگ سے خبر آجانے کے بعد بھی نہیں محبت ہتھیار ڈالنے پر آمادہ نہیں ہوتی۔ اُس میں تسلیم کی خُو ہی نہیں ہے وہ من مانی کرنا خوب جانتی ہے اور یہ سب جانتے ہوئے بھی میں نے بہت سخاوت سے اُس کے دامن میں انتظار کی اذیت ڈال دی اور اُس نے بھی کمال محبت سے اِس سوغات کو سمیٹ لیا تھا۔ اُسے معلوم تھا اس انتظار کا حاصل لاحاصلی کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن میں نے کہا ناں محبت میں تسلیم کی خُو ہوتی ہی نہیں، وہ من مانی کرنا خوب جانتی ہے۔ ایک اَن کہا بندھن تمام تر دوریوں کے باوجود روز بروز مضبوط تر ہوتا گیا اور ہم لاحاصلی کے اِس سفر میں ہجر کی اذیتوں تلے سسکتے رہے۔

نمائش ختم ہو چکی تھی۔ ہال کی روشنیاں گل ہونے لگیں۔ میرے اندر سناٹا بڑھ گیا تھا۔

''کیا میں خریدار کا نام جان سکتا ہوں؟'' میں نے مینیجر پاؤلو سے ہاتھ ملایا اور رخصت چاہی۔

''آف کورس مسٹر سلمانی! میں آپ کو جلد مطلع کروں گا''۔

آج چھ ماہ کے بعد مجھے اٹالین مینیجر کی طرف سے خط موصول ہوا: ''تاخیر کے لیے معذرت! خریدار نے رازداری کی بنیاد پر سودا طے کیا تھا۔ مجھے کچھ وقت لگا کھوجنے میں، بہر حال تفصیل حاضر ہے :

خریدار: حیات نجدی از شیراز، ایران

کل ادائیگی: 75 ہزار یوروز

افسانہ نویس: کنول بہزاد

پھولوں کا زیور

اس نے جب ہوش سنبھالا تو خود کو خوشبوؤں کے حصار میں پایا۔ گھر کے چھوٹے سے آنگن میں ماں نے گلاب اور موتیے کے ڈھیروں پودے لگا رکھے تھے۔ ماں سارا دن گلدستے، ہار اور گجرے بناتی۔ ایسے میں وہ خود بھی ایک مہکتے پھول کی مانند دلکش لگتی۔ اس کا باپ بھی اس کام میں ساتھ دیتا۔ وہ ایک گل فروش تھا مگر بیوپار پر جانے سے پہلے وہ اپنے ہاتھ سے بنائے گجرے ماں کے ہاتھ میں ضرور پہناتا، ایسے میں ماں کا چہرہ اور بھی گل رنگ ہو جاتا۔

وہ اپنی اس جنت میں شاداں و فرحاں تھا کہ ایک روز قیامت ہی ٹوٹ پڑی۔ اس کا باپ ایک حادثے میں اچانک چل بسا۔ ان کا ہنستا بستا گلشن وقت کی تند و تیز آندھی نے اجاڑ ڈالا۔ ماں کچھ دن تو سر منہ لپیٹے پڑی رہی، لوگ پرسا دینے آتے رہے مگر کب تک۔۔۔ ایک دن وہ اٹھی اور مرجھائے ہوئے پھولوں کو پانی دینے لگی۔ مالک سے بچھڑ جانے پر پھول بھی نوحہ کناں تھے، پھر سے توجہ ملی تو ان کی رعنائی لوٹ آئی۔

اب مجبوراً وہ پھول بیچنے جاتا۔ لوگ بچہ سمجھ کر اونے پونے پھول لے لیتے۔ بہ مشکل دو وقت کی روٹی پوری ہوتی۔ ماں اب پھول پرونے بیٹھتی تو جیسے اس کا چہرہ اور بھی مرجھا جاتا۔

''کاش! ماں پہلے کی طرح ہنستی مسکراتی تو کتنی اچھی لگتی'' وہ ماں کی گمشدہ مسکراہٹ واپس لانے کے لیے کئی کئی جتن کرتا۔ بے سروپا باتوں پہ خود بھی ہنستا اور ماں کو ہنسانے کی بھی کوشش میں رہتا۔ وہ اب بڑا ہو رہا تھا۔ اپنی اور ماں کی محرومی اور دنیا کے ظالمانہ رویے کو سمجھنے لگا تھا۔

ایک شام وہ واپس آیا تو ماں کی ہنسی کی آواز پر چونک گیا۔ گھر میں داخل ہوا تو ماں کے پاس ایک اجنبی مگر مانوس صورت والی موہنی سی لڑکی کو بیٹھے دیکھا۔ ماں کی نظر اس پر پڑی تو فوراً بلائیں لیں۔

''آ گیا میرا سوہنا پتر گلفام'' پھر ذرا توقف کر کے بولی: ''یہ چنبیلی ہے۔ سامنے والی خالہ زیتون کی بھتیجی، مانسہرہ کے ایک گاؤں سے سے آئی ہے۔ کچھ عرصہ یہاں رہے گی''۔

چنبیلی نے مسکرا کر اسے دیکھا تو وہ جھینپ کر کمرے میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد باتوں کی آواز آنا بند ہو گئی تو وہ باہر آیا۔

''نہ تو کیوں اندر چھپ کے بیٹھ گیا تھا؟ ویسے بڑی اچھی لڑکی ہے چنبیلی۔ اتنے مزے کی باتیں کرتی ہے کہ کیا بتاؤں۔ بے چاری کی ماں نہیں ہے۔ اس لیے باپ نے پھوپھی کے پاس بھیج دیا ہے کچھ دنوں کے لیے''۔ وہ ماں کو خوش دیکھ کر شانت ہو گیا۔

''لگتا ہے بہت دوستی ہو گئی ہے۔ چلو میری غیر موجودگی میں وقت اچھا کٹ جایا کرے گا تمہارا''

''پرائی بچی ہے روز میرے ساتھ تھوڑی بیٹھا رہا کرے گی۔ بھلا نہ ہو تو۔۔۔'' ماں پھر اداس سی ہو گئی۔

ایک رات چھاجوں مینہ برسا کہ ہر سو جل تھل ہو گیا۔ خنکی کے باعث گلفام کسل مندی سے بستر میں دبکا رہا۔ ماں نے باورچی خانے سے آواز دی تو وہ صحن میں چلا آیا۔

چھوٹے سے باغیچے سے پھول چنتی وہ چنبیلی ہی تھی۔ ہوا سے اس کے بال بکھر گئے تھے اور چند آوارہ لٹیں اس کے صبیح چہرے کو چھو رہی تھیں۔ آنچل کا پلو پھولوں سے بھر گیا تھا اور وہ مزید توڑے جا رہی تھی۔

''بس کر دیں۔ سارے پھول آپ نے چن لیے تو میرا کیا ہوگا۔۔۔'' وہ خلاف عادت اچانک بولا تو پھول چنتی چنبیلی چونک کر سیدھی ہوئی اور سارے پھول زمین پر بکھر گئے۔ وہ شرمندہ ہو کر آگے بڑھا اور پھول اٹھانے لگا۔ ''رہنے دیں مجھے نہیں چاہیے''۔ یہ کہہ کر اس نے دروازے کا رخ کیا اور جھپاک سے باہر نکل گئی۔

''اری چنبیلی کہاں گئی۔ کہہ رہی تھی موسم بڑا اچھا ہے۔ مجھے بھی پھول چاہئیں۔ پھولوں کا زیور بناؤں گی۔۔۔'' ماں نے ہک دھک کھڑے گلفام سے پوچھا۔

''معلوم نہیں، میں نے تو کچھ نہیں کہا۔ پھول چھوڑ کر چلی گئی اچانک۔۔۔''

''اچھا تو ناشتہ کر، میں اسے یہ پھول دے کر آتی ہوں'' ماں سارے پھول سمیٹ کر باہر نکل گئی۔

کتنے ہی دن گزر گئے نہ چنبیلی خود نظر آئی نہ ہی ماں نے اس کا ذکر کیا۔ جانے کیوں وہ مضطرب سا رہنے لگا۔ ایک بے وجہ اداسی نے دل میں ڈیرے جما لیے۔

''ماں! دعا کر مجھے کوئی مناسب دکان کرائے پہ مل جائے۔ کچھ جگہوں پہ بڑی مانگ ہے پھولوں کی۔ کام اچھا چل نکلے گا تو ہمارے دن بھی پھر جائیں گے''۔

''پر۔۔۔ دکانوں کے کرائے تو بڑے زیادہ ہیں۔ پیسے کہاں سے آئیں گے؟''

''میں نے کچھ پیسے جمع کر رکھے ہیں ماں! کچھ رفیق نے ادھار دینے کا وعدہ کیا ہے''۔ اس نے اپنے دوست کا نام لیا۔

''اللہ ضرور مدد کرے گا۔ تیرا کاروبار چل نکلے تو میں تیرے لیے دلہن ڈھونڈوں''۔ ماں آنکھوں میں خواب سجا کر بولی تو چنبیلی چھم سے اس کے تصور میں مسکرانے لگی۔

''اچھا ماں۔۔۔ میرے لیے ایسی دلہن ڈھونڈنا جسے پھولوں کا زیور بنانا آتا ہو'' گلفام شوخی سے بولا تو ماں ہنس کر بولی: ''چل بے شرم نہ ہو تو''

ایک روز وہ گھر سے باہر نکلنے لگا تو سامنے سے چنبیلی آتی دکھائی دی۔ وہ رک کر انتظار کرنے لگا۔ پاس آئی تو وہ ہمت کر کے بولا: ''ناراض ہو کیا؟''

''نہیں بہت خوش ہوں۔ مہمانوں کی آو بھگت اچھی کرتے ہیں آپ''

''غلطی ہو گئی۔ میں تو یونہی مذاق کر رہا تھا'' یہ کہہ کر گلفام نے دو گجرے اس کی طرف بڑھائے۔ کچھ دیر وہ چپکی کھڑی رہی پھر گجرے لے کر فوراً اندر چلی گئی۔

''زیتون خالہ رشتے دیکھ رہی ہے آج کل چنبیلی کے لیے۔ دراصل اس کے باپ نے اسی مقصد کے لیے بھیجا ہے بہن کے پاس''

ایک روز ماں نے اسے بتایا اور پھر پوچھا: ''تجھے دکان ملی؟''

گم سم بیٹھا گلفام چونک کر بولا: ''نہیں تو، ڈھونڈ رہا ہوں۔ کرائے بہت زیادہ ہیں''

ایک روز ماں محلے میں گئی ہوئی تھی کہ چنبیلی آ گئی۔ اسے اکیلا پا کر پلٹنے لگی تو گلفام نے بے ساختہ آنچل تھام لیا۔ اس کی کالی بھنورا آنکھوں میں حیرانی سمٹ آئی۔ آہستگی سے اس نے آنچل کا دامن چھڑایا مگر اپنی جگہ سے ہلی نہیں جیسے گلفام کی بات سننا چاہتی ہو۔

''چنبیلی کیا تم ہمیشہ کے لیے اس گھر میں رہ سکتی ہو میرے اور ماں کے ساتھ؟''

اس نے پہلے گلفام کو مسکرا کر دیکھا اور پھر ہنس دی۔ ماں کو واپس آتے دیکھ کر ایک دم چپ ہو گئی۔
''ارے تو کب آئی چنبیلی! آ اندر آ ناں'' ماں نہال ہو کر بولی۔

کتنے ہی دن خاموشی سے گزر گئے۔ ایک دن وہ مضمحل سا گھر واپس آیا تو ماں بھی اداس سی بیٹھی تھی۔ اس کے لیے کھانا لا کر سامنے رکھا۔ وہ بے دلی سے نوالے توڑنے لگا۔
''زیتون خالہ نے چنبیلی کا رشتہ حاجی عبدل کریانے والے کے بیٹے سے طے کر دیا ہے۔ اتنی سوہنی کڑی ان کے نصیب میں تھی۔ چنبیلی بھی بڑی خوش ہے۔ یہ سونے کا بڑا سا سیٹ ڈالا ہے انہوں نے بات پکی ہونے پر''۔ ماں اپنی رو میں بولے جا رہی تھی اور گلفام کے گلے میں نوالہ اور آنسو مل کر پھندا سا بن گئے تھے۔
اگلی صبح ماں کو دھاگے میں پھول پروتے دیکھ کر بولا: ''آج سے گجرے اور ہار نہیں بنانے۔ بس گلدستے ٹھیک ہیں'' اور خود تیزی سے پھولوں کی پتیاں نوچنے لگا۔
''ارے! یہ کیا کر رہا ہے؟ جھلا نہ ہو تو''
''تجھے نہیں پتہ ماں ان کی بڑی مانگ ہے۔ مجھے ایک بڑی سوسائٹی کے قبرستان کے باہر مناسب داموں میں جگہ مل گئی ہے''۔

★★★★★

افسانہ نویس: غبار آکاشمیری

پہنچی وہیں پہ خاک

پدم پور کے ایک نچان اور خنک گاؤں میں بوسیدہ عمارت کے اوپری منزل کے دوسرے کمرے میں بیٹھی ہم جولیاں پریتی سے بھیم گپت کی کہانی سن رہی تھیں۔ پریتی نے یہ کہانی اپنی والدہ سے سن رکھی تھی۔ اس کی والدہ اکثر اسے راجہ شریگال، راجہ نیاپال، راجہ ویر باہو، راجہ جے دیو وغیرہ کی جنم کنڈلی سے لے کر مرگ تک کے سبھی من بھاؤنے واقعات مکمل طور پر سنایا کرتی تھی۔ تین سال پہلے خزاں رُت کی اجاڑ رات دم بند ہونے کے کارن گزر چکی تھی۔ پریتی کا والد سنتری تھا جو اس کے بچپنے ہی میں بٹ ماروں کے ہاتھوں سورگ باش ہوا۔ دوسرے گاؤں کے بھی کچھ ودھیار تھی جو پریتی کے کالج میں پڑھتے تھے، ان کی بہنیں پریتی کے پاس اکثر آجایا کرتی تھیں۔ پریتی کے ہم جماعتوں میں امرش کمار دیگر طلبا سے نسبتاً زیادہ دل پسند اور سندر تھا۔ پریتی، لکشمی، پدماسن، کماری اور بینا سبھی اس سے مانوس ہو چکی تھیں۔ آج پریتی کہانی سناتے ہوئے بار بار مثالیں دینے کے لیے امرش کمار کی ظاہری وجاہت کے آنکنے میں زیادہ دلچسپی لے رہی تھی۔ وہ ایک مغرور لڑکا تھا۔ اس کے اسی ابھمان نے اس خوب ناک لگار کھی تھی۔ کالج میں وہ اکثر لکڑی کے چوکھٹے دار میز پر نوک دار پتری سے ناگر موتھا کی ٹہنی بنا کر اس میں نیارے رنگ بھرتا رہتا۔

پریتی ایک بھولی بھالی، ناآلودہ لڑکی تھی لیکن انت شوخ و چنچل۔ اس نے ناز و نخرے کے تو سبھی بند ھوے اڑا لائے تھے۔ ہر شبد میں طراری اور ہر راگ میں مدھم سُر کی لے اس کی پہچان تھی۔ کہانیاں سنانا اس کا حرفہ اور باتیں بنانا اس کا مشغلہ تھا۔ کبھی کبھی کوئی کویتا بھی کہہ دیتی جس میں نکھ سکھ درشن میں نازک بیانی اس کا آسان کھیل ہوتا۔ جبکہ اس کے مقابل امرش کمار کا آوازے پھینکنے، ہرزہ گردی کرنے، بد وضعی کی لانپیں اڑانے اور شاہد بازی کے علاوہ کچھ دھندانہ تھا۔

مگر پریتی کو اس سے پریم ہو گیا تھا۔ وہ امرش کے دھورے دھورے رہنے لگی تھی اور کالج میں دو تین مرتبہ اسے سجنیوں نے اس کا گھیرا توڑنے کی سکھشا بھی دی تھی لیکن سادہ دل پریتی کو اپنی کہانیوں کا راجہ مل چکا تھا۔ وہ امرش سے کھلے بالوں اظہارِ محبت کر چکی تھی جبکہ امرش کمار کے لیے پریم میں کسی پرشارتھ کی منشا کچھ اور ہی تھی۔ کچھ عرصہ وہ پریتی سے ٹلتا رہا لیکن کب تک؟ پریتی کا آکھلاپن اور سیدھا پا اس کے نفسی اپھان پہ پرچک ثابت ہوا۔ پھر کیا تھا؟ کلکلاتے لمحوں میں تب رضا و رغبت کے تال میل جُڑنے تک کون دیکھتا؟ نجانے کب امرش اور پریتی سے سم بھرم ہوا، نر اس کو آشا کی کمک پہنچی، کولا دنگیوں کا کیا سوال؟ من و تو کی لکیر ٹوٹی اور۔۔۔ فطری جوبن کا جوش آلود بھبکا گہری فضا میں پیرنے لگا۔ کچیں کچکچاتے دانتوں کے قبضے میں تھیں۔ کچھ دیر رمتا شریر کی ناڑیوں میں مور چھنا کی گھن گرج کروٹ بدلتی رہی اور آخر ش اس یُدھ کے نہائی پل کا سمے ہوا۔ زور دار شریر کا بھاری پنڈا ساکت کھاگ گھسیٹتا ہوا سہاونے پیکر سے پرے ہو چکا تھا۔

پریتی کالج چھوڑ چکی تھی اور امرش سے بھوگ بلاس کے اس ناقابل فراموش واقعے کے بعد پریتی کے من میں ہڑبڑی پڑ چکی تھی۔ پراگندہ حالی نے اسے مزید نزار کر دیا تھا۔ بیچاری کے کلے پچک گئے تھے۔ کہانیاں بھول کر جیون کتھا کا ماجرا اس کا روز مرہ بن چکا تھا۔ تین چوتھائی درجن مہینے گزر چکے تھے۔ پریتی کا شریر اب پھولتے پھولتے ایک دن دم زدن میں ہلکا بھی ہو گیا۔ آخری سمے تب امرش کمار بھی ساتھ تھا، پدم پور کے اسی بوسیدہ گھر میں۔ ان کے اپرادھ کی بھاؤ سبھا، بیٹی پیدا ہوئی تھی مگر

چونکہ سماج میں اس کے جیون کو جواز نہیں ملا تھا اس لیے چند ساعتوں بعد امرش کے ہاتھوں وہ قریبی کچڑا کنڈی کے ایک جھاڑی دار ٹیلے کے پرے بند ڈبے میں آخری سانسیں لے رہی تھی۔

اسی رات کے پچھلے پہر جبکہ اڑگن کا دھیما پن بڑھ رہا تھا، نیندر میں خلل کے کارن امرش کی سماعت نے کتوں کو بیش بسیار بھوگ سنائی۔ پاسا پلٹا تو نیندر کے اچاٹ پکھیر و پھُر سے بھوت آکاس کے اتھار ہنیرے میں گم ہو گئے تھے۔ چین اور بے چینی کی مخلوط کیفیت کے گہرے اثرات اس کے حواس پہ منڈلا رہے تھے۔ صبح اٹھتے ہی سمرت پور کا سفر طے کرنا تھا۔ سوچیں سرگوشیاں کر رہی تھیں کہ آنکھیں پھر مند گئیں۔

رات کا آخری حصہ اختتامی مراحل میں! کوڑے کباڑ سے پھیلی سڑانڈ سے لطف لیتے دو سیاہ و سفید کتے چہ مگوئیوں میں مگن کسی پر گھٹ بُو کے تعاقب میں کچھ ٹٹولتے ہوئے گتے کے ایک ڈبے کے اندر جھانکنے لگے کہ اچانک دونوں کی نظر سانجھے شکار پر پڑی۔ ناگاہ جھپٹا پڑا اور شکار دونوں کتوں کے نوکدار دانتوں میں پھنس گیا اور دم زدن میں دو بجروں میں منقسم ہو چکا۔ نیم شبی کے سمے امرش کمار کا چوبارہ بیرونی دروازے کے باہر کتوں کے غل غپاڑے سے گونج رہا تھا۔ نوچا کھسوٹی کرتے ہوئے کتوں کی بھنبھوڑ جاری تھی۔

''کم بخت یہ بھوگ مچاتے کتے اس سمے نیندر کا کلیجہ پکار رہے ہیں۔ دیکھوں تو! اس سمے یہ رولا کیسا بھڑک اٹھا ہے''

امرش نیندر کو پرے پھینکتا، سیڑھیاں روندتا ہوا بیرونی دروازے تک پہنچا۔ در کھولا اور کتوں کو پرے ہانکنے کے کارن پتھر اٹھانے کے لیے جُھکا۔ اندھیرے میں ایک انتڑی کا لیس دار ٹکڑا لمس کے قلعے میں آ دھمکا۔

''ارے! یہ کیا شے ہے؟'' امرش نے بغور دیکھا تو دھک سے پیچھے سمٹا۔ مزید ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ کتے بھاگ چکے تھے اور اپنا شکار یہیں چھوڑ گئے تھے۔

''اوہ بھگوان! یہ تو ہماری بچی.......!'' امرش کتوں کا شکار پہچان گیا تھا اور نیم حواسی میں شکار کا شکار ہو چکا تھا۔

★★★★★

افسانہ نویس: مرید عباس خاور

مسیحا کے نام

نیلم اسلام آباد کے حسین شہر کے اس علاقے میں پروان چڑھی جہاں ہر طرف سنگ سفید و سرخ کے بنے تاج محل تھے اور ان میں میرا مسکن بھی شامل تھا۔ ابو کی قریبی مہنگے علاقوں میں پراپرٹیز کرائے پر تھیں۔ وہ امیگریشن میں افسر تھے۔ پاکستان سے بڑی تعداد میں ہنر منداور عام افراد امریکہ اور یورپ جا کر قسمت آزمائی کے خواہش مند تھے۔ ان کے خوابوں کی تعبیر لندن اور نیویارک میں تھی۔ نائن الیون سے پہلے تو اس میں بے تحاشہ تیزی آئی۔ کچھ کی فیملیز بھی کوچ کر چکی تھیں۔ فروخت شدہ گھروں میں صرف بچپن، لڑکپن اور جوانی کے سائے سے شب و روز ان کی یادوں کے سہارے تیرتے پھرتے۔ کچھ تنہا گئے جو پونڈز اور ڈالرز بھیج رہے تھے۔ تاہم اس علاقے سے اکا دکا لوگ بھی بیرونِ ملک مہاجر نہیں ہوئے تھے کیونکہ سیکریٹیریٹ میں بے تحاشہ تنخواہیں اور اوپر کی آمدنیاں ان کے لیے یہیں یورپ اور امریکہ جانے والوں سے بھی زیادہ خوشحالی لا چکی تھی جس میں پاکستان کے نظریاتی معاشرے کی تشکیل کا دور دور تک گمان نہ تھا گویا ہم سب جناح کی نااہل اولاد کہے جا سکتے تھے۔ ہر روز یا دوسرے روز میریٹ ہوٹل میں ابو کو فیملی ڈنر پر مدعو کیا جاتا۔ ماں اس ''کمائی'' پر پشیمان تھی۔ وہ تحریکِ پاکستان کے ورکر کی بیٹی تھی اور ابو سے کہا کرتی ''جیسا بوؤ گے ویسا کاٹو گے، شریعت میں معافی ہے فطرت میں نہیں''میرے نظریات امی کی طرح تھے مگر گھر کو ٹوٹنے سے بچانے کے لیے وہ ابو کا ساتھ بادلِ نخواستہ دے رہی تھیں۔

تب میں نے اس فیز کے آخری گھر میں مقیم نیلم کو ایک ڈنر میں دیکھا۔ امیگریشن کے دیگر افسران کی فیملیز بھی شک سے بچاؤ کے لیے آس پاس موجود رہتیں۔ اجتماعی رشوت ہر ماہ تنخواہ کے وقت بانٹ لی جاتی۔ آوے کا آوا بگڑا ہوا تھا۔ ابو میزبان فیملی کے ساتھ ''مذاکرات''میں مصروف ہو گئے جن کے دو لڑکوں نے جو انجینئرنگ کر چکے تھے، کینیڈا جانا تھا۔ تب میں نے اس کوہستانی دوشیزہ کو کنکھیوں سے دیکھا۔ سکارف میں سے سرخ خضابی مائل گھنگریالے بال پکے رنگ کی بنا پر جھلملا رہے تھے۔ روشنیوں میں رخساروں پر دہکتے انار کے پھول بشری آنکھ کو حور کی یاد دلاتے تو ہلکے میک اپ میں چہرے کی نزاکت گل بہار کو شرماتی نظر آتی۔ وہ خواب جو کسی مثالی حسین دوشیزہ کے لیے دیکھا جا سکتا تھا میرے سامنے تھا اور میں مبہوت اس کی سبز آنکھوں میں کوئی جذبہ تلاش کر رہا تھا جو شفاف جھیلوں کے عکس دل پر اتار رہی تھیں۔ لباس سے تراش خراش پیکر کے جمال کا تصور ابھار رہی تھیں۔ مبہوت کرتی ہاتھوں کی نرم و نازک انگلیاں چاندنی کی کرنیں بن بن جاتیں اور زینتِ نسواں کشمیری دوشیزاؤں کے قیامت خیز ابھاروں جیسی شعلہ رنگ کہ ابھی لباس کے ریشم کو جلا دیں......اس نے عام کُرتہ شلوار اور سکارف کے ساتھ مخملیں چادر اوڑھی ہوئی تھی جس کے اندر کے ریشم بارے میں اندازے لگا رہا تھا۔ بے حد نفیس نازک پیروں کی سرخ چپلیاں رنگ میں پیکر کا حصہ لگ رہی تھیں۔ نفیس، نازک اور ملائم نقوش پیکر کے زاویے اسلام آباد کے شفق کو شرماتے نظر آئے جسے میں کونشن سنٹر کے بالمقابل سر سبز اور مسطح پہاڑیوں پر رہتے ہوئے ہر شام دیکھا کرتا۔ اس کے بھائی مہتاب سے اس کا تعارف حاصل کیا اور پھر ہم دونوں ہی ٹیبل پر رہ گئے۔ دونوں فیملیز ہوٹل کے ماحول میں خالی میزوں پر جگہ پا کر گفتگو میں محو تھیں۔ وہ ایک میڈیکل اینڈ ڈینٹل کالج میں نرسنگ کی سیکنڈ ایئر کی طالبہ تھی۔ پر اعتماد، جیسے میڈیکل کی طالبہ ہو۔

’’میں نے ٹرائی کی تھی‘‘، اس کا ریشمی سرخ ستواں ناک اس کے ناز کی گواہی دے رہا تھا۔ ’’مگر فیکلٹی کے نمبر ایم کیٹ کی تیاری میں شامل کر کے میرٹ نہ بنا سکے۔ چین میں میڈیکل ایجوکیشن کی آفر تھی مگر کھانے پینے بارے روایات نے کراہت بھر دی۔ میں جنگِ عظیم کی نرس فلورنس نائیٹنگیل کی پیروکار بن گئی۔ اس نے جنگِ عظیم کے زخمیوں کا خون صاف کیا اور تاریخ میں امر ہو گئی۔ وہ انسانیت کے نام پر تعفن اور غلاظت کی کراہت بھول گئی‘‘۔

مختصر ملاقات نے راتوں کی نیند اڑا دی۔ میں ایم بی ایس کے بعد سی ایس ایس کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کے تصور نے میری سٹڈیز پر اثر کیا۔ رات تو اس کے بیداری کے سپنوں کے لیے تھے وہ مجھے گھر داری کے کاموں میں نظر آئی۔

’’اپنے ہاتھوں سے کام کرنے میں اور ہی لطف ہے۔ آپ اپنا صدقہ نکال دیا کیجیے۔ غریب اور نادار خواتین میں تقسیم کر دیا کیجیے۔ جھاڑو تو میں ہی لگاؤں گی۔ کھانا تو میں ہی پکاؤں گی‘‘۔

’’اور نازک انگلیوں کے زخموں کا کیا کرو گی‘‘، میں اسے تصور میں دیکھتے ہوئے کہتا تو وہ بغیر جواب دیئے چلی جاتی۔ یوں میں پروین شاکر کی طرح سسٹم میں سیلیکٹ نہ ہو سکا۔ میرا خیال تھا شاعر لوگ اپنا اظہار کر کے اضطرابِ یاد سے جان چھڑا لیتے ہیں۔ تاہم میری سیلیکشن پولیس سروس میں ہو گئی۔ میرے اندر کے حاکمانہ مزاج کو مسرت ہوئی۔ میں بلیک بیلٹ تھا اور Athletics میں مسلسل حصہ لیا تھا۔

اس سے پہلے ہم کنونشن سنٹر اسلام آباد کے بالمقابل مسطح پہاڑیوں کی سرسبزی پر شام کو ملا کرتے ہماری گفتگو میں رات ہو جاتی۔ اس کے ساتھ اس کی کلاس فیلو آتی جو دور بیٹھ کر نوٹس سے تیاری کرتی رہتی۔ تاہم یہ ایک سالہ طویل خفیہ ملاقاتوں کا سلسلہ اب موقوف ہو گیا۔ کیونکہ میرے آرڈرز لاہور ہو گئے۔ تبھی ملک میں انسانی بم سامنے آئے تو مختلف اداروں نے منتخب پولیس افسران کے ریکارڈ کے پیشِ نظر ان کو حالات کے مطابق تربیت دی۔ مجھے بھی ان میں منتخب کیا گیا۔

ہم چھانگا مانگا کے جنگلوں کے انتہائی اندر گئے۔ ادھر آبادی نہ تھی۔ شاخوں پر لٹکتے سانپوں سے بچ بچا کر ہم نے ایک قدرتی چشمے کے کنارے پڑاؤ ڈالا۔ انسٹرکٹر کی رہنمائی میں ایک انسان کی لمبائی جتنی طویل اور اتنی ہی گہری اور چوڑی خندق کھودی۔ پھر جنگل کے خاردار درختوں سے ’’چھاپے‘‘ کاٹے اور ان سے خندق بھر لی۔ رات گاڑیوں پر واپس آ کر چھانگا مانگا کے سیاحتی مقام پر گذاری اور اگلی صبح چائے پی کر دوبارہ اسی مقام پر آئے جہاں سانپ اور دیگر حشرات الارض ’’چھاپوں‘‘ کی شاخوں پر اگے کانٹوں میں پروئے ہوئے تھے۔ انسٹرکٹر کے حکم پر پٹرول چھڑک کر ہم نے انہیں جلایا۔ ظہر کی نماز سے پہلے تک خندق کی صفائی کی رات کو کمبل بچھا کر اس میں لیٹ گئے مگر مجھے نیند کہاں؟ اس خوفناک سی صورتحال میں بھی نیلم میرے اعصاب پر چھائی ہوئی تھی۔ میں نے سب احوال ماں کو بتایا۔ وہ اگلے روز ہی رشتہ مانگنے چلی گئیں۔ نیلم ایک ہسپتال میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد ڈیوٹی دے رہی تھی۔ اس کے والدین نے ماں کو بتایا کہ نیلم کے لیے ان کے رشتہ دار ہارٹ سرجن کا رشتہ آیا مگر اس نے صاف انکار کرنے کی بجائے عجیب فیصلہ کیا۔ نیلم نے کہا کہ ان دنوں رشتوں میں استقلال باقی نہیں رہا۔ شادی کا سماجی بندھن مستحکم نہیں رہا۔ اس لیے بجائے اس کے کہ کل کو وہ پچھتائے اس نے ہمیشہ کے مددگار اللہ سے لو لگالی ہے۔ والدین بس اسے حج کرا دیں اسے اور کچھ نہیں چاہیے۔ میری امی نے صورتحال جانی تو خوفزدہ ہو گئیں۔ انھیں نیلم کی سائیکی پر شک سا ہونے لگا اور وہ گھر لوٹ آئیں۔ میں ایک ڈیوٹی نبھاتے شہر میں اپنی گاڑی میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ عین ممکن ہے نیلم نے میرے لیے یہ قربانی دی ہو یا جیسے وہ کہا کرتی تھی زندگی کی ابتدائی عمر کی جوانی میں اس نے یہ جذباتی فیصلہ کر ڈالا ہو کہ اچانک انسانی بم اور بلندی تک جاتے خون اور گوشت کے لوتھڑوں میں مجھے بھی جسم کے زیریں حصے میں گاڑی کے پرخچے اڑتے ہی شدید ٹیسیں محسوس ہوئیں۔

ہوش آیا تو میں سروسز ہسپتال کے انتہائی نگہداشت یونٹ میں تھا۔ مجھے بچانے کے لیے سرجنز کی ٹیم کو میری ٹانگیں

کاٹنا پڑیں اور پھر دو روز تک میں بول چال سے محروم بے ہوشی کے عالم میں ''میڈیکیٹ'' ہوتا رہا اور سرجیکل وارڈ میں شفٹ کر دیا گیا۔

اس پورے وارڈ میں اسی سانحے کے زخمی تھے جن کو اعضا سے محروم ہونا پڑا۔ میں ایک پولیس آفیسر تھا سو مجھے اس بات کا ناز تھا کہ وطن کی سیکیورٹی کے لیے میرے اعضا قربان ہوئے مگر عام آدمی خود کو بے گناہ اور اس معاملے سے غیر متعلق پا کر شدید مایوسی کا شکار تھا۔ وارڈ کے سبھی زخمی مقدر اور قسمت کو کوستے نظر آتے۔ ڈاکٹرز، نرسیں، پٹی، گولیاں، انجکشن، ڈرپ،......زندگی سکڑ کر رہ گئی تھی اور پھر ایک دن اسلام آباد کے حسن کی بہار نیلم اوور آل پہنے آئی۔ اب تک ویسی پُر جمال۔ سب مایوس آنکھیں اسے دیکھ کر قدرت کے شاہکار حسن اور تخلیق کی عظمت پر تحیر مسرت میں مبتلا ہو گئیں اور میں بیک وقت دو مقامات پر تھا۔ پہلا مقام وہی جہاں میں موجود سن رہا تھا: ''آپ کے والدہ دیر سے آئیں ورنہ میں یہ فیصلہ کیوں کرتی؟'' دوسرا مقام کنونشن سنٹر اسلام آباد کے بالمقابل مسطح سرسبز پہاڑی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی: ''ہم گھر کا نقشہ ایسا بنائیں گے جس میں ہیر کے بیلے کے ساتھ ساتھ سسی کے صحرا کا مشترکہ منظر ہو۔ یہ بنوانا آپ کی ذمہ داری ہے''۔

''مجھے نہیں معلوم کہ کس طاقت نے مجھے ٹانگیں عطا کی تھیں مگر میں نیلم کے ساتھ ساتھ رواں دواں تھا۔ شفق آسمان پر زیادہ گلابی تھا''۔

★★★★★

افسانہ نویس: آئمہ بخاری

بویا ہے جو

رات کا آخری پہر تھا۔ بادل بہت زور سے گرج رہے تھے اور موسلا دھار بارش کے ساتھ ساتھ تیز آندھی بھی جاری و ساری تھی۔ خراب موسم کے پیش نظر شہر بھر کی بجلی بند کر دی گئی تھی جس کی وجہ سے سارا علاقہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور بجلی کڑکنے کے باعث پیدا ہونے والی لمحے بھر کی روشنی سے کسی بھوت بنگلے کے مترادف لگتا تھا۔ نواحی بستی میں موجود ایک چھوٹے سے تاریک گھر کے ایک کمرے میں انتہائی پرانی لالٹین کی روشنی ٹمٹما رہی تھی۔ یہ مدھم روشنی بتا رہی تھی کہ لالٹین کا تیل ختم ہونے کو ہے اور آنے والے کسی لمحے میں یہ ٹمٹماہٹ دم توڑ جائے گی۔ ان سب باتوں سے بے نیاز ایک شخص اسی کمرے میں ٹوٹے ہوئے شیشوں والی کھڑکی کے پاس رکھی بوسیدہ کرسی پر براجمان تھا۔ ہاتھ میں قلم تھا جو ویسی ہی بوسیدہ میز پر بکھرے کاغذوں پر باری باری اپنی سیاہی کو الفاظ کی شکل میں ڈھال رہا تھا۔ کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشوں سے بارش کی پھوار کمرے کے اندر بھی آ رہی تھی لیکن آج وہ ان سب چیزوں سے بے نیاز اپنا کام کرنے میں مگن تھا۔ یہ شخص اس پرانے گھر کا مالک شیر دل تھا۔ اس کے ماں باپ ایک حادثے کی نذر ہو چکے تھے۔ شیر دل ابھرتا ہوا قلم کار تھا۔ اخلاقیات سے بھرپور کہانیاں اور افسانے لکھنے پر اس کی خوب حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ وہ اپنے اس عمل سے بہت خوش تھا کہ اس بے راہ روی کے دور میں وہ اپنے قلم کی طاقت سے بھلائی کے پھول کھلا رہا ہے۔

''بلاشبہ تمہارے لفظوں میں جادو ہے شیر دل! میری شدید ترین خواہش ہے کہ تم محبت پر ایک ایسا شاہکار لکھو جو ادب کی دنیا میں تہلکہ مچا دے''۔ ایک مشہور ادارے کے سربراہ نے اپنی شاطر آنکھیں اُس پر جماتے ہوئے اُسے سراہا تھا۔

اس بات پر شیر دل نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا تھا۔ اس کے لیے یہی بہت بڑی بات تھی کہ اِتنے بڑے ادارے کے مالک نے اسے ملاقات کے لیے بلایا تھا اور اپنے لفظوں سے سراہ رہا تھا۔

''میں چاہتا ہوں کہ تم ویلنٹائن ڈے کی مناسبت سے محبتوں سے لبریز ایک ایسا ناول لکھو جسے پڑھ کر ہر عمر کے قارئین متاثر ہوں۔ ایسا محبتوں کا امین ناول جسے پڑھنے کے بعد سب لوگ محبت کرنے لگیں''۔ اس نے شیر دل پر نظریں جماتے ہوئے اپنی بات مکمل کی تھی جب کہ اب اُسے اِن نظروں سے خوف محسوس ہوا تھا۔

''لیکن سر!..................ایسی محبت پر؟..................'' شیر دل نے الجھن سے صرف اتنا ہی کہا تھا۔ وہ ایسی محبتوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا، کجا کہ اس پر ناول لکھ ڈالے۔ وہ صرف اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق مثبت کہانیاں لکھنا جانتا تھا جو دلچسپ اور مقصدیت سے بھرپور ہوتی تھیں۔ لیکن اب اِسے جس شاہکار کی فرمائش کی جا رہی تھی اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

''جی بالکل! ایسی محبت کے حق میں بہترین ناول، جسے لکھنے پر نہ صرف تمہیں ہمارے ادارے میں مستقل ملازمت ملے گی بلکہ تمہارے لیے پُرآسائش زندگی کی راہ بھی ہموار ہو گی''۔ اس نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے شیر دل کی طرف دیکھا اور ایک بھرپور مسکراہٹ اس کی طرف اچھالی۔ وہ شیر دل کے حالات سے اچھی واقف تھا اس لیے ملازمت کا لالچ دینا نہیں بھولا تھا۔

''سر میں کوشش کروں گا''۔ شیر دل نے کچھ دیر سوچنے کے بعد اپنا جواب دے دیا تھا۔ مستقل ملازمت اور

پُر آسائش زندگی کا سن کر اس نے اخلاقیات کو پسِ پشت ڈالنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔
''ویری گڈ مائی بوائے! کچھ اور رائٹرز بھی لکھ رہے ہیں۔ سب کے پاس یہ ناول لکھنے کے لیے دو ہفتے ہیں۔ یکم فروری شام پانچ بجے تک آپ یہاں اپنے ناول کے ساتھ موجود ہوں''۔ سربراہ نے اسے شاباش دیتے ہوئے تفصیل سمجھا دی تھی۔
دن بہت کم تھے اور وہ دن رات ناول لکھنے میں مشغول رہتا۔ اُس کے دل کا سکون اس سے روٹھ کر کوسوں دور چلا گیا تھا۔ پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا لیکن اس بار عجیب سی بے چینی اس کے دل میں گھر کر گئی تھی اور وہ اپنے لفظوں میں حرام محبتوں کو جائز قرار دیتا جا رہا تھا۔ آج آخری رات تھی اور یہ بات خوش آئند تھی کہ اب وہ مطلوبہ ناول کی آخری سطور لکھ رہا تھا۔ ایک دم کمرے میں تیز روشنی پھیلی اور بجلی اتنا زور سے کڑکی کہ اس نے بے اختیار اپنے دل پر ہاتھ رکھا۔
''آج بے سکونی کی آخری رات ہے، اس کے بعد مستقل ملازمت اور خوشیاں ہی خوشیاں''۔ کچھ لمحے بعد اس نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے مسکرا کر سوچا اور کرسی سے ٹیک لگاتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔
صبح ہوئی تو ہر چیز نکھری نکھری لگ رہی تھی۔ اس کی آنکھ کھلی تو ہاتھ منہ دھویا۔ موبائل پر شام چار بجے کا الارم لگایا اور ناشتہ کیے بغیر ہی ناول پر نظرِ ثانی کرنے لگا کیوں کہ اس کے پاس شام پانچ بجے تک کا وقت تھا اور اس نے ہر حال میں پہنچنا تھا۔ سارا دن وہ اسی میں لگا رہا۔ اسے اپنی دو ہفتے کی مسلسل محنت کا پھل ملنے والا تھا۔ ناول دیکھ لینے کے بعد دیوار گیر گھڑی پر وقت دیکھا اور کچھ دیر آنکھیں موند کر آرام کرنا چاہا۔ کچھ ہی دیر میں الارم بج اٹھا اور وہ جانے کے لیے تیار ہونے لگا۔ نسبتاً اچھے کپڑے پہنے، ناول کی فائل سکوٹر پر رکھی اور سرشار سا اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ بڑی سڑک پر پہنچتے ہی تیز رفتار گاڑیوں اور بے ہنگم شور نے اس کا استقبال کیا۔ کچھ دیر وہ یونہی سفر کرتا رہا اچانک کسی چیز سے ٹکرایا اور اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

اس کی آنکھ کھلی اور سر میں شدید درد کا احساس ہوتے ہی اس کا ہاتھ اپنے سر تک گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سوچتا، ایک آواز نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔
''مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے کہ آپ عام نوجوانوں کی طرح حادثے کے وقت تصاویر بنانے کے بجائے انھیں ہسپتال لے آئے اور ان کی جان بچ گئی''۔ تقریباً پچاس سالہ ایک آدمی جو حلیے سے ڈاکٹر لگ رہا تھا وہ ایک لڑکے کو سراہتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
''میں بھی پہلے تصاویر بنا کر آگے چلا جاتا تھا لیکن اب اپنے پسندیدہ مصنف شیر دل صاحب کی اچھی باتیں پڑھ کر عمل کرنے کی کوشش کرتا ہوں''۔ لڑکے نے جیسے ہی جواب دیا ایک مسکراہٹ نے شیر دل کے لبوں کا احاطہ کیا اسی لمحے شیر دل کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ دونوں اس کی طرف متوجہ ہو گئے، لڑکے نے آگے بڑھ کر اس کو موبائل اٹھا کر دے دیا۔
''ہیلو مسٹر شیر دل! ہم آپ کا انتظار کر رہے ہیں''۔ اس کے کال اٹھاتے ہی کہا گیا تھا۔
''بہت معذرت سر! میں ویلنٹائن کے حق میں ناول نہیں لکھ سکتا، بہت شکریہ!'' شیر دل نے سکون سے جواب دے کر کال کاٹی اور قریب رکھی اپنی فائل اٹھا کر اس کے ٹکڑے کر دیے۔ کمرے میں موجود دونوں نفوس اپنی آنکھوں میں اس کے لیے احترام لیے مسکرا دیے۔

★★★★★

غلام مصطفیٰ دائمؔ

کلامِ غالب؛ تعبیر و تجزیہ

(سلسلۂ شرحِ کلامِ غالبؔ کی دوسری قسط)

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو برا کہتی ہے لیلےٰ مرے آگے

معشوق فریبی : معشوق سے متعدد مقاصد کے حصول کے لیے کوئی ایسا حیلہ کرنا جس سے معشوق بے خبر ہو، معشوق فریبی کہلاتا ہے۔ اس کام میں عاشق کے پیشِ نظر کوئی معقول تاویل ہوتی ہے جس کی روشنی میں مطلوبہ امر پر معشوق کا جلد یا بدیر یقین کر لینا ممکن ہوتا ہے۔

ہمارا روایتی معشوق فریب دہی (Deceiving) میں مشہور ہے۔ وہ عاشق کو کبھی وصل سے مکرتے ہوئے حیلہ سازی سے کام لیتا ہے، کبھی رقیب کی طرف داری میں کسی مکرِ معشوقانہ سے عہدہ برآ ہوتا ہے۔ لیکن غالبؔ کہتے ہیں کہ میں باوجود عاشق ہونے کے، معشوق فریب ہوں۔ میں عقلی دلائل کی روشنی میں خود کو دنیا کا سب سے بڑا عاشق ثابت کر دیتا ہوں۔ میری اسی فریب آرائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ لیلیٰ بھی میرے سامنے مجنوں کو برا کہتی ہے۔

لفظِ ''فریبی'' میں ایک نکتہ ہے کہ غالب شعوری طور پر مجنوں کو بڑا عاشق سمجھتے ہیں اور اپنے خام عشق سے بھی آگاہ ہیں۔ لیکن غالب کا خاص وطیرہ ہے کہ وہ اپنی کمزوری کو بھی حسنِ اظہار سے ثروت مند کر دیتے ہیں اور یوں ''معشوق فریبی'' کے ساتھ ساتھ ''قاری فریبی'' کا بھی خوب خوب اہتمام کرتے ہیں۔ اس ضمن میں معشوق فریبی کی جو شان مؤمنؔ کے ہاں موجود ہے اس کی جھلکیاں بھی دیکھنی چاہئیں۔ [حاشیہ ☆]

☆...... ماہنامہ نگار، شمارہ نومبر 1963ء میں عندلیب میرٹھی نے ایک مضمون بہ عنوان ''مؤمن کی معشوق فریبیاں'' میں تفصیل سے لکھا۔ ان کے انتخاب کردہ چند اشعار دیکھیں:

عبث تم کو پڑی الفت، وہ کب دیتا تھا دم تم پر
منظور ہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں
دربان کو آنے دینے پہ میرے نہ کیجے قتل
غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
کس دن تھی اس کے دل میں محبت، جواب نہیں
میں ایک سخت جان ہوں گردوں سے پوچھ لو
ہے دوستی تو جانبِ دشمن نہ دیکھنا
گلا ہم کاٹ لیں گے آبِ تیغِ رشک سے اپنا
گرز کرِ وفا سے یہی غصہ ہے تو اب سے

عبث تم کو پڑی الفت، وہ کب دیتا تھا دم تم پر
منظور ہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں
دربان کو آنے دینے پہ میرے نہ کیجے قتل
غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
کس دن تھی اس کے دل میں محبت، جواب نہیں
میں ایک سخت جان ہوں گردوں سے پوچھ لو
ہے دوستی تو جانبِ دشمن نہ دیکھنا
گلا ہم کاٹ لیں گے آبِ تیغِ رشک سے اپنا
گرز کرِ وفا سے یہی غصہ ہے تو اب سے

''برا کہنے'' سے کچا عاشق یا ناکام عاشق کہنا مراد ہے۔
''مرے آگے'' کہنے میں متعدد وجوہ ہیں:
(الف) میری موجودگی میں، یعنی میرے ہوتے ہوئے
(ب) اگر مجنون میرے سامنے بھی ہو، تب بھی لیلیٰ اسے برا کہتی ہے۔
(ج) میرے مقابلے میں، یعنی مجھ سے تقابل کرتے ہوئے

حافظ شوکت میرٹھی لکھتے ہیں: مجنوں کو لیلیٰ یہ طعنہ دیتی ہے کہ غالبؔ میں جو معشوق فریبی کا جذبہ ہے وہ تجھ میں نہیں۔ اس نے معشوق کو فریفتہ کر لیا مگر تو مجھے فریفتہ نہ کر سکا۔

حافظ میرٹھی کا بیان کردہ یہ مفہوم دو وجہوں سے غلط ہے:
(الف) بیخود موہانی لکھتے ہیں کہ: جب لیلیٰ خود غالب کو معشوق فریب سمجھ گئی ہے تو شعر کا لطف جاتا رہا۔
(ب) معشوق فریبی کو ''جذبہ'' سے تعبیر کرنا بھی سخن فہمی کی شان نہیں۔

سید ضامن کنتوری نے یہاں دو اعتراض اٹھائے ہیں:
(الف) لیلیٰ مجنوں کو برا کیوں کہتی ہے؟
(ب) خود ان کا معشوق انھیں کیا کہتا ہے؟

اس ضمن میں خلاصتہً لکھتے ہیں کہ غالب کا فریبی ہونا ثابت ہے نہ لیلیٰ کا مجنوں کو برا کہنا۔ محض بے دلیل دعویٰ ہے۔

جواب: ان دونوں اعتراضات کے جواب سے قبل شعر کی ایک نزاکت سے واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے۔ شعر میں یہ کہیں نہیں کہا گیا میں لیلیٰ کو فریب دیتا ہوں۔ شعر میں لفظ "معشوق" اپنے عموم پر ہونے کے باوجود غالبؔ کا معشوق مراد ہے۔ دیگر معشوق غالبؔ کی اپنے معشوق سے اس دلداری، کمالِ محبت اور خلوص و وفا پر رشک کرتے ہوئے اپنے اپنے عاشقوں پہ طعنہ زن ہیں۔ یہاں لیلیٰ کا ذکر کمالِ عاشقی کا شعور دلانے کے لیے ہے۔ یعنی جب لیلیٰ غالب کے عشق و وفا پر رشک کرتے ہوئے مجنوں کو برا کہہ سکتی ہے تو دیگر معشوقوں کا حال کیا ہوگا! ۔ اب ضامن کے دونوں اعتراضات رفع ہو گئے۔ لیلیٰ مجنوں کو برا اس لیے کہتی ہے کہ: تجھ میں وہ خوئے وفا اور جاں نثاری کا جذبہ نہیں جو غالب میں ہے۔ اور خود ان کا معشوق انھیں کیا کہتا ہے؟ اس کا جواب لیلیٰ کے ذکر ہی میں بیان ہو گیا۔

بعض شُرّاح [مثلاً یوسف سلیم چشتی] نے اس شعر کا مرکزی خیال ''تفوق بر مجنوں'' لکھا ہے۔ یاللعجب! درست یہ ہے کہ ''معشوق فریبی'' کلیدی خیال ہے۔

★★★★★

حمزہ یعقوب

غزل

زمیں کے قبلہ نماؤں کو پچھلی مرتبہ آزما لیا تھا
اسی لیے اس سفر میں قطبی ستارے سے مشورہ لیا تھا

ہماری دنیا میں جتنی چیزیں تھیں سب کی ہیئت بدل گئی تھی
خزاں کی رت میں کسی نے شاید بہار کا گیت گا لیا تھا

تمھی بتاؤ کھرے کو کھوٹے سے کس طریقے الگ کیا جائے
یہاں کے لوگوں نے تو کلیشے کی شکل میں فلسفہ لیا تھا

میں جانتا ہوں کہ اس کے ہونٹوں پہ کیا ہے اور اس کے دل میں کیا ہے
کہ میں نے اصلی متون پڑھنے کے بعد ہی ترجمہ لیا تھا

تمھارے کہنے پہ اپنے چہرے سے اس نے زلفیں ہٹا تو لی تھیں
مگر بتاؤ کہ بھینٹ میں اس چراغ نے تم سے کیا لیا تھا

میں ہنستے ہنستے تمھاری آنکھوں کے سامنے خودکشی کروں گا
تمھیں پتہ تو چلے کہ میں نے سکون کا بھید پا لیا تھا

خمار میر زادہ

غزل

پھول ہیں عکس ہے خوشبو بھری پُروائی ہے
میں ہوں اور رنگ بدلتی ہوئی تنہائی ہے

آنسوؤں میں بھی فروزاں ہے کوئی کاہ کشاں
سسکیوں میں بھی کسی نوع کی شہنائی ہے

جھاڑتے جھاڑتے ہم اپنے بدن جھاڑ چکے
آج کی شام بہت دیر میں سنولائی ہے

سرسری میں، مرا احساس، مری تہہ داری
زندگی تیرے اشارے میں بھی گہرائی ہے

گوشۂ خلوتِ بے زار ہے آئینہ مجھے
یہ مری خواب گری ہی مجھے دارائی ہے

پیرہن چاک ہوا کرتی ہے عریانی تک
ایسی مجھ میں کسی خواہش کی زلیخائی ہے

میرے سب لوگ مجھے اُس میں نظر آتے ہیں
ان دشاؤں میں کسی انت کی پہنائی ہے

رات کے ٹیلوں پہ لہراتے ہوئے سائے کی
جاگتی آنکھوں میں سوئی ہوئی انگنائی ہے!

مامون الرشید

غزل

لِبِس بھرا اشک، بےقراری سے
گر پڑا آنکھ کی پٹاری سے

شب کے آنگن میں نیند کا پیپل
کٹ گیا رتجگے کی آری سے

سہما سہما سا یاد کا جگنو
دل کے صحرا کی تابکاری سے

اپنی تنہائی بانٹ لیتا ہے
جھانک کر آسماں کی باری سے

اُس طرف آئنہ مقابل تھا
لوٹ آیا میں چاند ماری سے

ہاتھ آیا نہ شعر کا ریشم
سوچ لپٹی رہی اُساری سے

سر پہ سورج اٹھائے پھرتا ہے
دن کو مطلب نہیں گہاری سے

اب تو کٹھ پتلیوں نے ٹھان لیا
کھیل ہو گا مگر مداری سے

نیلم ملک

غزل

نور بھری پر جب راتیں بےنور ہوئیں
چاند کی پریاں مرنے پر مجبُور ہوئیں

ایک چُھوَن میں ٹھنڈی پوریں جاگ اُٹھیں
بےرَس آنکھیں جیون سے بھرپُور ہوئیں

شہر میں چلتے پھرتے، تجھ کو دیکھ لیا
مجھ پر یہ پتھریلی سڑکیں طُور ہوئیں

دُور سے آتی دَھم دَھم کی آواز میں گم
کان جَھڑیں گے ڈھولکیاں جب کُور ہوئیں

شہنائی کے رَس میں رسنے والوں پر
ماتھا پیٹتی زرد رُتیں رنجور ہوئیں

چڑیاں پنکھ پسارے اُن پر خوب ہنسیں
تیتریاں جب پنجروں میں محصُور ہوئیں

دیوی موتی پھانکے، کرچیں دان کرے
داسی کو کرچیں بھی موتی چُور ہوئیں

ساتویں دھن میں شعر کہا مستانی نے
چھ جہتیں جب اُس کی خاطر پُور ہُوئیں

عرفان شہود

ارتکاز

ثبت ہیں
میرے دل پہ کئی گھاؤ سنسار کے
یاد رکھی ہیں فرشِ زمیں نے
کھڑے پھول کی نرمیاں
کچی مٹی پہ کتنے حسیں موسموں کی وہ دھندلی مہک اب بھی آباد ہے
رینگتی عمر کی بدلیوں میں حسیں بارشوں کی کمائی نہیں
کھو کھلی شکل کا دائرہ بن گیا ہے
کئی بھوت مجھ کو پرانے محلے کے اب بھی ڈراتے ہیں
ماں باپ کے واقعے یاد آتے ہیں
قبروں کے کتبوں پہ تاریک دن سرسراتے ہیں
پہلی محبت کے پرجوش تارے کہیں جھلملاتے ہیں
لیکن مجھے سسکیاں لینے والوں سے کوئی گلا ہی نہیں ہے
مجھے کھوجنی ہیں کئی بستیاں
خود کو مصروف رکھنا ہے
بے جان رشتوں پہ جی بھر کے رونا نہیں
نقش گہرے بھی ہوں تو کسی شکل پر تلملانا نہیں

....

سر بسر سوزِ بے چار گی کو پرونا نہیں
مضطرب قیر گوں رات میں مجھ کو
کھونا نہیں
غم کے کتنے ہیولے مری کشتیوں کو ڈبونے چلے تھے
مگر میرے تختے اُبھرتی ہوئی تند لہروں میں بھی تیرتے ہی رہے
اب بھی زخموں کی ٹیسوں سے کانوں میں طوفان کا شور ہے
میں نے بجھتے چراغوں کی لو کو بھی دیکھا نہیں تھا
مگر شعلگی زیرِ دامن اُٹھی ہے
یہ عرفان بہروپیا
زندگی کی الجھتی ہوئی ریشمی گرہی سے پرے
ایک گاؤں کے کچے محلے میں جاڑے کی راتوں میں
چائے پیے گا
اِسی کیف میں زندگانی جیے گا

فاطمہ مہرو

بھنورا

تتلیوں کی برق پوشاکوں میں لتھڑا اک طرف
اک طرف ہے خواہش و امید کا جلتا جہاں
سرخ آتش، ارغوانی، جھلملاتے جا بجا
شاخ پہ زینہ بہ زینہ، کونپلوں پہ تہہ بہ تہہ
گل سہانی لذتوں کے جب نظر پہ چھا گئے
دیکھتے ہی دیکھتے بھنورے وہیں پہ آ گئے
ایک سے وعدہ کیا ہے رنگ کے سنگھار کا
طے شدہ اک اور عہدِ صحبتِ مہکار سا
اِک سبوئے مست ہے تتلی کا ہنسنا بولنا
لازمی بھنورے کا پی کر بے طرح سے ڈولنا
اک گنہ کی تیز بھڑکیلی تپکتی آگ میں
مر گیا کل ایک بھنورا پھر کسی کی تاک میں

گلناز کوثر

میں کیا لکھوں؟

نظم اِک جیتی جاگتی الجھن
نظم پہیلی
نظم کا باطن کس پہ کھلا ہے؟
رنگ برنگے پھولوں کی جھاڑی کے پیچھے
جَھر جَھر بہتی دھوپ کا چہرہ
جلتی سڑک پر جھُلسے پاؤں کس نے دیکھے؟
لفظوں کے پنچھی چہکے تو
وہیں کہیں فریاد تھی، اک ہچکی تھی
اور اِک آہ بھی تھی
جو اوجھل رہ گئی
میں نے درد میں دھول ملائی
تم نے اُڑتا بادل دیکھا
میں نے دل کا ٹکڑا کاٹا
بہتے خون کی دھار اڑائی
تم نے اس کو چھم چھم کرتی برکھا سمجھا
میرے آنسو حرف کے چاک پہ گھومتے گھومتے پانی ہو گئے
لمبے کالے بالوں والی
ایک ہُوکتی رات تھی میری جس کے بدن سے
چاند کو توڑ کے تم نے اپنی نیند سجائی، خواب بنایا
لیکن اِس کے اندر بیٹھے
بھل بھل روتے اک دھبے کا
راز نہ کھولا
بھید نہ پایا

ناصر کریم

یہ مشکی آپ کا گھوڑا نہیں ہے !

یہ مشکی آپ کا گھوڑا نہیں ہے !
جایئے خچر سدھایا کیجیے
عالی جناب !
ان ٹٹوؤں کے پیچھے رہ کر
نام پیدا کیجیے
اس فربہی مائل جسامت رکھنے والی
کھیپ پر چشمِ کرم فرمایئے
خچر سے دل بہلایئے

گھر اصطبل ہے
اصطبل میں
تھوڑا تھوڑا کاٹھ اکٹھا کیجیے
پھر کاٹھ کا ٹٹو بنا کر کھیلیے
گھر جایئے بھاڑے کے ٹٹو کی کمر پر بیٹھ کر اٹھکیلیے
یہ عشق کے میدان کا گھوڑا یقیناً آپ کا گھوڑا نہیں ہے !
اصطبل کے جانوریوں بھی ذرا حسّاس ہوتے ہیں

....

انہیں سہلایئے
کن سوئیاں لیتے ہوئے خچر سے باتیں کیجیے
دھیمے سروں کی فرفراہٹ پر فدا ہو جایئے
اور ہنہناتے جایئے

منحوس کالے مشک رنگی عشق رنگی گھوڑچوں میں کیا پڑا ہے؟
ٹٹوؤں کے واری واری جایئے
گھر جایئے
اور
ٹٹوؤں کی پشت پر ڈھولک بجاتے جایئے

شاعر : نزار قبانی
مترجم : ناہید ورک

Light is more important than the lantern

چراغ سے زیادہ اہم روشنی ہے

چراغ سے زیادہ اہم روشنی ہے
بیاض سے زیادہ اہم نظم ہے
اور ہونٹوں سے زیادہ اہم بوسہ ہے

ہم دونوں سے کہیں زیادہ اہم
تمہارے نام لکھے ہوئے میرے یہ خطوط ہیں

صرف یہ خطوط ہی وہ دستاویز ہیں
جن میں لوگوں کو
تمہاری خوبصورتی
اور میرے دیوانے پن
کے ثبوت ملیں گے

شمارہ ہذا کے لکھاری حضرات

ڈاکٹر کاشف عرفان

پروفیسر رحمان حفیظ

محمد شاہد حفیظ میلسی

منیر فراز

تنزیلہ شبیر

شاہین کاظمی

کنول بہزاد

مرید عباس خاور

آئمہ بخاری

غبار کاشمیری

غلام مصطفیٰ دائم

حمزہ یعقوب

خمار میرزادہ

مامون الرشید

نیلم ملک

عرفان شہود

فاطمہ مہرو

گلناز کوثر

ناصر کریم

ناہید ورک

انتظامیۂ سخن دان کی طرف سے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

کیاادب سماج پراثر ڈالتا ہے؟ (شمس الرحمن فاروقی)

شاعری، یا فکشن، یا کسی بھی صنف ادب کا اثر سماج پر پڑتا ہے، یہ معاملہ بہت مشکوک ہے۔ اور اگر مشکوک نہیں تو متنازعہ فیہ ضرور ہے۔ ارباب اقتدار، اور خاص کر مستبد اور آمر ارباب اختیار (جیسا کہ سوویٹ روس کا معاملہ تھا) ہر اس شے سے خوف کھاتے ہیں جو کسی نہ کسی طرح ان کی قوت یا با اختیار حیثیت کو شک کی نظر سے دیکھتی ہو، یا دیکھ سکتی ہو۔ ادب میں چونکہ یہ صلاحیت بہت ہوتی ہے، کہ وہ ہر شے، ہر خیال، ہر صورت حال پر آزادانہ اور اپنے تصور یا تاثر یا وقتی جذبے کی روشنی میں اظہار خیال کر سکے، اس لئے مستبد اور جابر طبقہ ادب سے خوف کھاتا ہے کہ نہ جانے کب وہ کیسی بات کہہ دے اور کس انداز میں کہہ دے۔ اسی لئے ایسے تمام معاشروں میں، جو استبداد پر مبنی ہوں، ادب (یعنی اظہار خیال) پر پابندی ہوتی ہے۔

یہ بات غور کرنے اور سمجھ لینے کی ہے۔ ادب، یا اظہار خیال پر پابندی کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ جابر اور آمر کو ادب سے خطرہ ہوتا ہے، بلکہ جابر اور آمر کو اختلاف سے ڈر لگتا ہے۔ اختلاف اس کے اعتماد کو متزلزل کر دیتا ہے۔ اختلاف سے اس کے آمرانہ غرور کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ اس وجہ سے وہ ادب، یا اظہار خیال پر پابندی لگاتا ہے۔ یعنی یہ پابندی اس لئے نہیں ہوتی کہ اسے خوف ہے کہ ادب (یا ادب کی کوئی بھی صنف) سماج پر اثر انداز ہوگی، اور یہ اثر اس کی طاقت کے لئے، یا 'امن عامہ' کے لئے، یا 'عوام کے اخلاق' کے لئے مضر ہوگا۔ اسے تو اختلاف رائے سے خوف ہے، چاہے وہ اختلاف کتنے ہی کمزور الفاظ میں یا کتنے ہی کمزور انداز میں بیان کیا جائے۔ (مثلاً کوئی بلاگ، جس کا پڑھنے والا بلاگ نویس کے سوا کوئی نہ ہو، حکومتیں اس سے بھی ڈرتی ہیں۔)

اب رہی یہ بات، جو بہت مشہور ہے، کہ سماج پر ادب کا اثر ہوتا ہے، تو یہ بالکل غلط ہے۔ ہم ادیبوں نے اپنی انا کی تسکین کے لئے یہ مفروضہ گھڑ لیا ہے کہ ہم سماج کے لئے بہت اہم ہیں، ہم رائے عامہ پر اثر انداز ہوتے ہیں، ہم ملکوں کی تقدیر بدل سکتے ہیں، اور اگر اتنا نہیں تو یہ تو ضرور کر سکتے ہیں کہ لوگوں کو کسی گوشوارۂ عمل کی طرف مائل کر دیں۔

یہ سب باتیں محض طفل تسلیاں ہیں۔ ان کو عام کرنے میں پرانی کتابوں کا بھی کچھ ہاتھ ہے جن میں غیر مصدقہ واقعات اس طرح درج کئے گئے ہیں گویا وہ بالکل تاریخی ہوں۔ مثلاً یہ کہ عرب میں فلاں قبیلے کے لوگ جنگ کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے جب فلاں شاعر نے ان کی غیرت کو للکارا۔ یا اس کے بہت دن بعد ایران کے رودکی نے بادشاہ کو اپنے اشعار سنائے جن میں وطن کے دریاؤں اور اس کے خوش گوار ماحول کی یاد کا مضمون تھا تو بادشاہ صاحب فوراً کھڑے ہو گئے اور پوری فوج کو وطن واپس لے گئے۔ یہ سب حکایات ہیں۔ ممکن ہے سچ ہوں، ممکن ہے اس طرح سچ نہ ہوں جس طرح ہم انھیں سمجھتے ہیں۔ چھوٹے موٹے اور سادہ معاشروں میں، جہاں زیادہ تر چیزیں فوری اور زبانی ہوتی تھیں، ممکن ہے ایسے واقعات کبھی کبھی پیش آجاتے ہوں لیکن ان سے ادب کی حقیقت نہیں، بلکہ معاشرے کی حقیقت ظاہر ہوتی ہے۔